یاد کیجیے

ہمارے رہنما

جلد۔ 4

مترجم : غلام حیدر

چلڈرن بک ٹرسٹ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بچوں کا ادبی ٹرسٹ

Portraits by R. Ashish Bagchi

پہلا انگریزی ایڈیشن : 1993

پہلا اُردو ایڈیشن : مارچ۔ 1999

تعداد اشاعت : 3000

© چلڈرن بک ٹرسٹ، نئی دہلی۔

قیمت : 35.00 روپے

This Urdu edition is published by the National Council for Promotion of Urdu Language, M/o Human Resource Development, Department of Education, Govt. of India West Block-I, R.K. Puram, New Delhi, by special arrangement with Children's Book Trust and Bachchon Ka Adabi Trust, New Delhi and printed at Indraprastha Press (CBT), New Delhi

دیانند سرسوتی

اے۔ کے۔ سری کمار

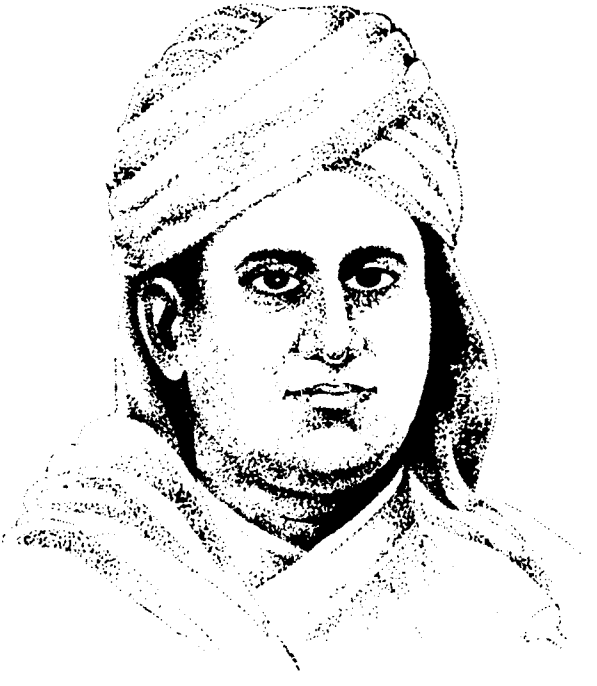

خواہ کوئی کچھ کرے، مگر اپنا راج ہرحال میں سب سے اچھا ہے۔ غیر ملکی حکومت، چاہے وہ مذہبی اور نسلی تعصبوں سے کتنی بھی پاک ہو اور ماں باپ جیسی شفقت، محبت اور عدل وانصاف سے بھری ہو، عوام کو پورا فائدہ نہیں پہچا سکتی۔

"ستیارتھ پرکاش" میں دیانند سرسوتی

سوامی دیانند سرسوتی

کرسن جی بڑی بے چینی سے انتظار کررہے تھے ۔ ان کی دعا تھی۔ بس ایک لڑکا ہوجائے ان کے یہاں۔ ایک صحت مند لڑکا جس سے گجرات کے موربی قصبے میں ان کے ترویدی خاندان کا نام باقی رہ جائے۔

کرسن جی ترویدی تحصیل دار۔۔ ضلع کی تحصیل کے بڑے افسر۔۔۔ تھے ۔ اور پھر جیسے ہی ایک دائی دوڑتی ہوئی آئی اور انھیں لڑکے کی پیدائش کی اطلاع دی تو وہ خوشی سے اچھل پڑے ۔ 12 فروری 1824 کو یہ بچہ دنیا میں آیا اور اس کا نام مول شنکر رکھا گیا۔ دھرم کرم کے پابند کرسن جی نے اسی وقت عہد کیا کہ وہ اس بچہ کو پکا شِو بھگت بنائیں گے۔ (شِو بھگت ہندو مذہب کی ایک شاخ ہے جس میں بھگوان شِو کی پوجا ہوتی ہے)

وہ چاہتے تھے کہ یہ بچہ ویدوں کا ایسا زبردست گیانی ہوجائے کہ شاستر ہی اس کا اوڑھنا بچھونا ہوجائیں۔

خوش نصیبی سے باپ کو بیٹا بھی ایسا ملا کہ اس کے پاس عقل وفہم اور انھیں استعمال کرنے کی صلاحیتوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ تھوڑی سی عمر میں ہی مول شنکر کو چاروں ویدوں کا پورا گیان حاصل ہوگیا ابھی وہ چودہ سال کے ہی تھے کہ وہ شاستروں کے ہر حصے کو بے جھجک پڑھ سکتے تھے ۔گرامر پر بحث کرسکتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے فلسفے پر عالموں سے گفتگو کرسکتے تھے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں جب مول شنکر کے پتاجی نے

1828 میں ان سے مہاشوراتری کے موقع پر پوجا اور برت رکھنے کی فرمائش کی تو وہ خوشی سے اس کے لئے تیار ہوگئے۔ بیٹے کو شوجی کے اس درشن کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا، جو اس مقدس رات میں شو بھگتوں کو رات بھر کی پوجا اور برت کے بعد نصیب ہوتا ہے۔ مول شنکر کو اس کے پتاجی نے اس کا یقین بھی دلایا تھا۔

درشن

دوسرے بھگتوں کے چلے جانے کے کافی دیر بعد بھی تھکن سے چور مول شنکر شوجی کے مندر میں مقدس چبوترے کے سامنے بیٹھے رہے۔ آنکھیں درشن کے لئے بے قرار اور من میں پورا یقین کہ وہ ضرور درشن دیں گے۔

مگر یہ کیا؟ چوہے! یہ کہاں سے آگئے؟ یہ زمین کے ناپاک کیڑے مقدس چبوترے پر کس ڈھٹائی سے بھاگ دوڑ رہے تھے۔ مقدس ترین مورتی بھی ان کی زد سے بچی ہوئی نہیں تھی۔

بھگوان خود آکر ان کمبخت بے ادبوں کو سزا دیں گے، مول شنکر نے سوچا اب ان کے دل میں امید اور دعا دونوں مل کر ایک خواہش سی بن گئے تھے۔ لیکن کچھ زیادہ دیر نہ لگی کہ ان حملہ آوروں نے بھگتوں کے چڑھاووں کا ریزہ ریزہ چٹ کرکے ساری جگہ پر جھاڑو سی پھیر دی۔ چوہے جی بھر کے پورے مندر میں دھما چوکڑی مچاتے پھرے۔ اور بھگوان کو نہ آنا تھا نہ آئے۔

مول شنکر وہیں جمے بیٹھے رہے۔ کچھ دکھ کچھ بے اعتباری، دونوں نے ان کے ذہن کو جکڑ لیا۔ بھگوان اپنے چڑھاوے کی مٹھائیوں کو کیسے ان چوہوں کو کھانے دے سکتے ہیں؟ چوہے انھیں کھاتے رہے اور وہ اپنی جگہ سے ٹلے تک نہیں!

نوجوان ذہن اٹک گیا۔ اس شک اور بے اعتباری کے ساتھ اب وہ اس جگہ اور

زیادہ دھیان نہیں لگا سکتے تھے۔ کیا ان کا سارا پوجا پاٹ اور بھگوان سے گیان دھیان سب اکارت ہوگیا!

مول شنکر مندر سے باہر آگئے۔ چوٹ کھایا ہوا دماغ بے اعتقادی اور شک وشبہ سے چکرا رہا تھا۔

جو بھگوان خود اپنے کو نہ بچا سکے وہ مول شنکر اور دوسرے غریب انسانوں کو کیا بچائے گا؟ عجیب اُکھڑے اُکھڑے خیالوں میں الجھا دماغ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اب وہ کم سے کم پتھر کے بھگوان پر تو اپنا عقیدہ قائم نہیں رکھ سکتا۔ اگر کوئی پیدا کرنے والا ہے ۔۔ تو یہ تو نہیں ہے ۔۔ نہ وہ یہاں رہتا ہے۔ مندر میں یا پتھر کی مورت کے روپ میں!

وہ جہاں کہیں بھی ہے، مول شنکر نے عہد کیا، میں اسے پاکر رہوں گا۔ میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک بھگوان میری سن نہ لیں، مجھے میرے سوالوں کے جواب نہ دے دیں۔

حق کی تلاش

اس کے بعد تھوڑے سے عرصے میں ہی دو ایسے حادثے بھی ہوئے جنھوں نے اس نوجوان کے اس خیال کو ان کے دل میں اور اٹل کردیا کہ اب انھیں گھر اور اپنے پیاروں کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہونا چاہیے۔

1840 میں جب ان کی ایک بہن، جس سے وہ بہت محبت کرتے تھے، دو چار دن کی بیماری میں ہی مرگئی تو اس واقعے نے ان کے نازک دماغ کو ہلاکر رکھ دیا۔ اس نے کیا خطا کی تھی جس کی سزا اس غریب نے بھگتی۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی کہ بڈھے ٹھڈے تو جیتے رہیں اور ان کی پیاری ننھی منی بہن کی زندگی کا چراغ ایک پھونک میں بجھادیا جائے۔!؟ نوجوان دماغ تڑپ رہا تھا۔

پھر تین سال بعد 1843 میں جب تک ان کی بہن کی موت کا زخم ابھی بھرا بھی نہ تھا، مول شنکر کو ایک اور جھٹکا لگا۔ ان کے ایک شفیق چچا بھی دنیا سے رخصت ہوگئے۔

زندگی اور موت کے بھیانک سوال، انسانوں کی آرزوئیں اور تمنائیں جو آدھی ہوتی ہیں کبھی پوری ہوتی ہیں کبھی بالکل نہیں ہوتیں اور ایسے گمبھیر سوالوں نے نوجوان ذہن کو جکڑ سا لیا۔ اور پھر جیسے جیسے گھر بار اور آس پاس کی دلچسپیوں سے مول شنکر کا دل ہٹنا شروع ہوا تو کرسن جی کو بھی ان کی طرف سے فکر بڑھی۔ کچھ پریشان ہوکر باپ نے سوچا کہ ان کی شادی کرکے انھیں گھر بار کے جھمیلوں میں پھنسا دینا ہی شاید سب سے اچھا علاج ہوگا۔ چنانچہ ماں باپ نے بڑے ارمانوں کے ساتھ اپنے لڑکے کے لیے ایک اچھی سی دلہن بھی تلاش کرلی۔ مگر مول شنکر ان بندھنوں میں کب پھنسنے والے تھے۔ ان کے دماغ میں گھر چھوڑ نکلنے کا خیال تو پہلے ہی جڑ پکڑ چکا تھا۔ اس شادی کی تجویز نے اسے اور ہوا دی اور اب ایک نوجوان دماغ نے اٹل فیصلہ کرلیا۔ بہرحال اس سلسلے میں کسی قسم کے ہنگامے اور شوروشغب کی بجائے انھوں نے بالکل خاموشی سے یہ کام کرنے کی ٹھان لی۔ اور آخر 1846 کی گرمیوں کی ایک رات میں وہ چپ چاپ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اس وقت مول شنکر صرف بائیس برس کے تھے۔

خاموش، پرسکون اور اٹل فیصلہ کرلینے کی یہ صلاحیت مول شنکر کی پوری زندگی میں ایک ممتاز خصوصیت رہی۔ جب ان کے دماغ میں کوئی بات جم جاتی تھی تو پھر دنیا کی کوئی رکاوٹ انھیں منزل پر پہنچنے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔

مول شنکر نے یہ فیصلہ گھر چھوڑتے وقت ہی کرلیا تھا کہ اب وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک وہ بھگوان کو نہ پاجائیں اور بھگوان ان کے ہر اس سوال کا جواب نہ دے دیں جن پر ان کا ذہن اٹکا ہوا تھا۔۔۔ زندگی اور موت، خوشی اور غم اور ایسے ہی سوال ان کے ابھرتے ہوئے ذہن میں ایک ہلچل مچائے ہوئے تھے۔

اس بات کا تو انھیں پورا یقین تھا کہ جن سوالوں نے ان کے ذہن کو جکڑ رکھا ہے تو ان کے جواب کم سے کم موربی کے ودوان اور پنڈت تو کبھی نہیں دے سکتے۔ اسی لئے مول شنکر نے بڑے جوکھم بھرے راستے اپنے لیئے چنے۔ وہ جنگلوں بیابانوں میں گھستے چلے گئے تاکہ اس گمھا گھمی کی دنیا سے دور چلے جائیں۔

جنگلوں کے سرسبز شاداب حصوں میں بھی ایسی زندگی کے دوہرے پن نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہاں جن گیانیوں اور سادھوؤں نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے ان میں بھی انھیں کچھ نقلی نظر آئے کچھ ڈھونگیے اور پاکھنڈی۔ کسی کو اپنی گہری سمجھ بوجھ پر ناز تھا تو کوئی تقدس اور پاکی کا ڈھونگ رچائے تھا۔

ایسے ہی ایک خانہ بدوش قسم کے سادھوں سنتوں کی ٹولی کے حکم کی تعمیل میں مول شنکر اپنی وہ ساری جمع پونجی بھی گنوا بیٹھے جو وہ ساتھ لے کر چلے تھے۔ ایک صبح انھیں پتہ چلا کہ سادھوؤں کا وہ جرگہ غائب تھا۔ اور ظاہر ہے سادھو ان کے زیور اور جمع پونجی لے جانا نہیں بھولے تھے۔ بہر حال مول شنکر اس بات پر کھسیائے نہیں بلکہ کچھ سکون ہی محسوس کیا۔ اب اس فقیر کو جس نے غربت اور بے سروسامانی کی گدڑی خود اوڑھی ہو دنیا کی ان چیزوں کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ان کی خیال میں تو ان ٹھگوں نے موہ اور مایا کی اس دنیا کی آخری نشان بھی ان سے واپس لے کر ان کے ساتھ کچھ کرم ہی کیا تھا۔ نوجوان مول شنکر خوش تھے۔

سدھا چیتنیا

مول شنکر کی تلاش و جستجو جاری رہی۔ نوجوان قدموں نے پورے گجرات کو۔۔۔ پہاڑیوں، میدانوں، کھیتوں، بنجر زمینوں۔ سب کو چھان ڈالا۔

اتفاق سے ان کی ملاقات لالا بھکت نام کے ایک سنت جی سے ہوئی جو گاؤں سے

تعلق رکھتے تھے۔ پھر یہی ملاقات ان کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ جو کپڑے مول شنکر اس وقت پہنے ہوئے تھے اس تپسوی کی نگاہ میں وہ بھی کسی جوگی کے جسم پر شوبھا نہیں دیتے تھے۔

"جو منزل تم نے اپنے لئے چنی ہے"، سادھوجی نے کہا، "اس کے لئے پہلا قدم ہے "بھگوے (زعفرانی) کپڑے"

اس کے بعد سنت لالا بھکت نے انھیں مراقبے یا دھیان، اور بتھ یوگا کی تعلیم دی۔ اس ذہنی اور جسمانی تربیت اور ریاضت نے انھیں زندگی بھر کے لئے ایک بڑی قیمتی نعمت عطا کردی۔ ایک مضبوط جسم اور اچھی صحت جس نے آخری سانسوں تک ان کا ساتھ دیا۔

کچھ دن بعد انھیں لگا کہ ابھی کچھ باقی ہے۔ تلاش و جستجو کی اس لگن نے انھیں پھر بے چین کرنا شروع کردیا۔ ان کے بے چین دل نے کہا۔ آگے بڑھو اور آگے بڑھ کر ان سوالوں کے جواب تلاش کرو جن کی خاطر تم نے اپنا پیار بھرا گھر چھوڑا ہے۔ مول شنکر کو احساس ہوا کہ یہ آشرم مجھے جو کچھ دے سکتا تھا وہ دے چکا، اور بس ان کی لگن نے ان کے قدموں کو (گجرات میں ہی) سدھ پور کی طرف لگادیا۔

سدھ پور میں جوگی مول شنکر کی زندگی کے بہاؤ میں پہلی بار کچھ اصلی رکاوٹ بھی پیدا ہوئی۔ ان کی ملاقات موربی کے ہی ایک پرانے دوست سے ہوئی۔ مول شنکر جواب "سدھا چیتنیا" کہلانے لگے تھے اپنے دوست سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ مگر ان کے دوست نے ان کا راز فاش کردیا۔

اور پھر وہی ہوا جو عام طور پر ہوتا ہے۔ وہ دوست مول شنکر جی سے ملاقات کی خبر جلدی سے جلدی کرسن جی تریویدی تک پہنچانے موربی واپس آئے۔ اس طرح باپ بیٹے کی ملاقات کا پھر ایک موقع پیدا ہوا۔ کرسن جی تحصیلدار اپنے کچھ ملازموں کے ساتھ بڑے

فخر سے سدھ پور پہنچے۔ تھوڑی بہت کھوج کے بعد مول شنکر تک بھی پہنچ گئے اور انھیں کسی قدر سختی کے ساتھ اپنے ساتھ واپس لے آئے۔ اپنے باپ سے بحث و تکرار کو بے سود سمجھ کر مول شنکر وقتی طور پر چپ ہی رہے مگر مناسب موقع کی تلاش میں رہے۔ ان پر باپ کی ساری شفقت، پیار، محبت، ڈانٹ، پھٹکار کسی چیز کا کوئی اثر نہ ہوا اور جو منزل انھوں نے اپنے لئے چن لی تھی اسے حاصل کرلینے کا عزم وقت کے ساتھ ساتھ اور مضبوط ہوتا چلا گیا۔ آخر کچھ زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ مول شنکر کو موقع مل گیا۔ اور وہ خاموشی سے پھر گھر چھوڑ کر نکل لیے۔ اس واپسی میں نہ کسی قسم کا شور تھا نہ جھگڑا ٹنٹا۔ انھیں اپنی منزل معلوم تھی اور وہ اسے کسی قسم کے ہنگامے یا ہلچل کے بغیر حاصل کرلینا چاہتے تھے۔

اب یہ سادھو نرمدا کے کنارے کنارے چل پڑا۔ اس راہ میں ان کی بڑے بڑے عالموں اور گیانیوں سے بھینٹ ہوئی۔ ان میں سے انھیں کچھ عارفوں سے تھوڑا بہت گیان یا عرفان بھی حاصل ہوا، لیکن کچھ لوگ انھیں خالص ڈھونگی اور مصنوعی نظر آئے۔ مگر سدھا چیتنیا لے سب سے اسی سکون اور اطمینان کے ساتھ جو ان کے کردار کی ممتاز خصوصیت بن چکے تھے۔ ان سادھو سنتوں میں ایک بزرگ سچدا نندجی نے چیتنیا کی اس بنیادی خواہش پر ہی سخت اعتراض کر ڈالا کہ وہ دنیا کو تیاگ کر سادھو بن جائیں۔ ان کا کہنا تھا کہ چیتنیا ابھی اس زندگی کی سختیاں اور تکلیفیں جھیل لینے کے لئے بہت چھوٹے ہیں۔ بہرطور، ان کے منع کرنے کے باوجود مول شنکر اپنی چنی ہوئی منزل کی طرف بڑھتے رہے۔ تلاش و جستجو جاری رہی۔

اپنے والد سے ان کی یہ ملاقات بھی اپنے خاندان کے کسی شخص سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے ساتھ ہی مول شنکر نے اپنی پچھلی زندگی سے ہر رشتہ آخری بار توڑ لیا۔ اور پھر کبھی مورپی یا اس زندگی کی طرف مڑکر نہ دیکھا جو انھوں نے وہاں گذاری تھی۔

گرو اور چیلا

نو عمر سادھو نرمدا کے کنارے کنارے اوپر بڑھتا رہا۔ اور پھر ایک دن سنت پور ناتند سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اصل میں انہی بزرگ تیاگی اور گیانی عالم نے ان کی غیر معمولی سمجھ بوجھ اور لگن سے متاثر ہوکر انھیں سادھو سنتوں کے نظام میں باقاعدہ طور پر قبول کرلیا۔ پگھلی چاندی جیسے پانی سے لبریز نرمدا کے کنارے ایک پرسکون صبح کو جب سورج نے زمین پر روشنی بکھیرنی شروع کی تو مول شنکر نے دنیا کو تیاگ دینے کا باقاعدہ عہد کیا۔ آج مُنڈے ہوئے سر اور بادامی رنگ کے لبادے میں لپٹے جسم کے روپ میں ہندوستان کی روحانی فضا میں ایک نیا دمکتا ستارا اور ابھر آیا۔

اور اس کے ساتھ ہی سوامی دیانند سرسوتی نے جنم لیا۔

بہر حال دیانند نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ نرمدا کے کنارے سے وہ مغرب کی طرف بڑھے اور دوارکا پہنچ گئے۔ دوارکا کے سوامی یوگانندا سے انھوں نے یوگا کی بہت سی شاخوں کی مہارت حاصل کی۔ پھر انھوں نے جنوب کی طرف رخ کیا اور اس کے ساتھ سنسکرت ادب اور گرامر کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس سفر میں اب انھیں اپنی جسمانی تکلیفوں کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا، کبھی کبھی تو وہ کھانے پینے اور سونے جیسی ضرورتوں کو بھی بھول جاتے تھے۔ اور اس طرح یہ سادھو ایک سے دوسری جگہ جنگل جنگل وادی وادی گھومتا رہا۔ زندگی اور موت، خوشی اور غم، تپسیا اور مکتی یا ریاضت اور نجات کے وہ بنیادی سوال ان کے دل ودماغ میں برابر ہلچل پیدا کئے رہے جنھیں وہ لے کر پہلے دن اٹھے تھے۔

اس تیاگی کی راہ میں بہت سے لالچ اور خواہشیں بھی رکاوٹ بن کر سامنے آئیں۔ ان میں سے ایک لُبھاؤ ہمالیہ پہاڑ کی سُہانی وادیوں کے اوکھی مٹھ میں پرسکون زندگی گزارنا بھی تھا۔ لیکن اس مٹھ میں چین سے زندگی گزارنے والے سادھو اس نوجوان سنیاسی کے انکار

سے حیران رہ گئے ۔ انھوں نے سوچا یہ تو دیوانا ہے ۔ خیر، کچھ بہت زیادہ غلط بھی نہیں سوچا۔ چونکہ ان دنوں، اور آج بھی، دنیا کو تیاگ کر باداموں لباس پہن لینا بھی پیٹ بھرنے کا ایک طریقہ ہے ۔

بہر طور اس بات کو تو ماننا ہی پڑے گا کہ ان تجربوں سے دیانند اپنے فیصلے سے ذرا بھی پیچھے نہیں ہٹے یا ان کے دماغ میں کسی قسم کی کڑواہٹ یا جھنجلاہٹ پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ ہوا یہ کہ ایسے ہر ایک تجربے کے بعد ان کے عزم میں اور زیادہ مضبوطی اور پختگی پیدا ہوئی کہ انھیں اپنے سوالوں کا جواب حاصل کرنا ہے اور اس سچ کو تلاش کر کے دم لینا ہے جس کے لیے وہ گھر بار چھوڑ کر نکلے ہیں۔

اس لیے جب انھیں متھرا کے ایک اندھے وِدوان سادھو ویر جانند کا پتہ چلا تو دیانند اس طرف چل پڑے ۔ یہ سادھو اس وقت کے سب سے بڑے عالم مانے جاتے تھے اور ہر شخص ان کی بزرگی کا قائل تھا، اور یہ مانتا تھا کہ علم اور ریاضت میں سوامی ویرجانند جیسا کوئی دوسرا نہیں ہے ۔

14 نومبر 1860 کو متھرا پہنچ کر دیانند نے سوامی ویر جانند کی خدمت میں حاضری دی پھر اس نوجوان سادھو نے ان وِدوان ویر جانند جی کے ہر ٹیڑھے سیدھے سوال کا صحیح اور فوری جواب دیا۔ اس بات کو پوری طرح سمجھتے ہوئے کہ روحانی تعلیم اور ریاضت کے کڑے امتحانوں اور تیاگ کی زندگی کی تکلیفوں کو جھیل لینا ہر اس شخص کے بس کی بات نہیں ہے جو خود کو سادھو کہلوانے لگتا ہے، سوامی ویر جانند نے انھیں بھی اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن جلدی ہی وہ اس نوجوان کی دیانت داری، سچائی اور دماغی یکسوئی کے قائل ہوگئے ۔ اور پھر جب ویر جانند نے دیانند سے کہا کہ اپنے تمام سفروں کے دوران جمع کی ہوئی ساری کتابیں سب کی سب ایک دم چھوڑ دیں تو نوجوان نے بے چون وچراں اُن کے حکم کی تعمیل کی اور ان تمام موٹی موٹی پوتھیوں کو جو انھوں

نے بڑی دشواریوں اور پریشانیوں کے بعد حاصل کی تھیں جمنا کے پانی کی بھینٹ چڑھا دیا۔

حالانکہ ویرجاتند جی دل میں اپنے اس نئے شاگرد کے قایل ہوچکے تھے مگر انھوں نے اس کا اظہار نہیں کیا بلکہ انھوں نے اس شاگرد پر پابندیاں کچھ اور سخت کردیں۔ جسم اور دماغ کی قوتِ برداشت کو مضبوط کرنے کے لئے شاگرد کا ہر طرح سے امتحان لیا گیا۔ مگر واہ رے شاگرد۔ وہ ہر امتحان میں نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ ان میں کچھ اور مضبوطی پیدا ہوئی۔ آخر نہ چاہتے ہوئے بھی ویرجاتند کو اپنے اس شاگرد کی غیر معمولی سمجھ بوجھ اور ممتاز حیثیت کا اقرار کرنا ہی پڑا۔ لیکن پھر اپنے وعدہ کے مطابق اپنے ایک سچے شاگرد کے دماغ کو علم کے نور سے منور کرنے کے لیئے ایک سچے عالم نے بھی اپنی تمام صلاحیتیں اس پر نچھاور کردیں۔ دیاتند دو سال سے زیادہ متھرا میں رہے۔

پھر جب جدائی کا وقت آیا اور استاد نے اپنا معاوضہ (گرودکشنا) طلب کیا تو شاگرد نے بھی جو کچھ اس کے پاس تھا جسم، دماغ، علم، روح سب کچھ ان کو پیش کردیا۔ مگر ویرجاتند جی کو کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ "نہیں ان سب کے بدلے میں" بوڑھے عالم نے سمجھایا، "دنیا میں چلے جاؤ اور اپنے جسم، دل، دماغ، روح سب کو اس گیان کو پھیلانے میں لگادو جو تم میں پیدا ہوچکا ہے۔ اس زمین پر اندھکار چھایا ہوا ہے ـــ جہالت، ہٹ دھرمی، مکاری اور ریاکاری کے طور طریقوں کا بول بالا ہے۔ تمھیں گناہوں اور خطاؤں کے اسی گھیرے میں گھسنا ہے۔ ساری دنیا بھلے ہی تمہارے خلاف کھڑی ہوجائے مگر اس مہایدھ میں تمہارے ہتھیار صرف تمہارا جسم اور تمہارا دماغ ہوں گے۔ جہالت کو مٹادو، بت پرستی کو ختم کردو، اپنے دور کے انسانوں کو یہ بات ماننے پر مجبور کرو کہ ایسے رسم ورواج اور دکھاوے کی پوجا پاٹ کو چھوڑ دیں جو ان کی زندگی اور ان کی توانائیوں کو گھن کی طرح کھا جاتے ہیں۔ ویدوں کے پرکاش کو پوری دنیا میں پھیلاؤ اور اسے گھر گھر تک پہنچادو ویدوں اور شاسترؤں کا علم اور روشنی جو ہماری غلطیوں سے لوگوں کی نگاہوں سے چھپ گئے ہیں وہ ایک بار پھر

ایک ایک دل و دماغ پر ظاہر ہو جائیں۔"

چنانچہ جب 1863 میں اس نوجوان نے متھرا کو خیرباد کہا تو گرو کی طرف سے اُسے یہی آگیا دی گئی تھی اور یہی گرو دکشنا، تھی جس کا وعدہ انھوں نے اپنے استاد سے کیا تھا۔ اس طرح اس جنگ کے لئے جو انھیں اپنی پوری زندگی لڑنی تھی ان کے پاس ایک اٹل ارادے اور استاد کے آشرواد کے علاوہ اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔

اندھیرا

انیسویں صدی کے درمیانی حصے تک ہندوستان پر برطانوی جھنڈا لہرا چکا تھا۔ چھوٹے چھوٹے علاقوں کے کمزور بادشاہوں، رجواڑوں اور ڈچ، پرتگال، فرانسیسی اور انگریز ہمت آزما تاجروں کے چنگل سے نکل کر اس برصغیر کا بڑا حصہ اب برطانوی تاج کی حکومت میں تھا۔

ہندوستان دنیاوی اور ذہنی ترقی کے اعتبار سے مغلیہ دور میں اپنے عروج پر پہنچ کر اب چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ چکا تھا۔ راجہ رجواڑے بھی اپنی شان و شوکت کھو چکے تھے اور یہاں کی آبادی جہالت اور وہم پرستی میں مبتلا تھی جس وقت انگریز اپنی اس حکومت کی بنیادیں ہندوستان کی زمین پر جمانے میں مصروف تھے جسے اگلی ایک صدی تک ملک پر راج کرنا تھا، اس ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی جن کے دلوں میں یہاں کی روح اور تہذیب کا بھی درد موجود ہو۔ حملہ آور جان بوجھ کر ایسے اداروں کو تباہ کرنے میں لگے ہوئے تھے جو صدیوں میں اس ملک میں پروان چڑھے تھے۔ حالانکہ مشنریوں نے مغربی طرز کی تعلیم اور اس کے اسکولوں کو ملک میں بڑی تعداد میں پھیلایا ضرور مگر ان اداروں نے کم علم اور گمراہ لوگوں کی ذہنی ترقی میں مدد دینے سے کہیں زیادہ انگریزی حکومت کو مضبوط کرنے کا کام انجام دیا۔

یہ وہ وقت تھا جب سماج میں ہر طرف وہم پرستی اور خالص لفظی بحث مباحثوں کا راج تھا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے خود مختار حکمراں جن کے پاس نام کے علاوہ اب اپنی کوئی طاقت باقی نہیں رہی تھی۔ عیش وعشرت، آپسی سازشوں اور بے کار وقت ضائع کرنے میں مگن تھے دوسری طرف گنڈے اور بدمعاش قسم کے لوگ ملک کی سیدھی سادی آبادی کو اپنی زیادتیوں کا شکار بنائے ہوئے تھے۔

عام لوگ جو دیسی اور بدیسی دونوں قسم کے حکمرانوں کی زیادتیوں کا شکار تھے ان بیچاروں کو ظاہری مذہبی رسموں میں ہی پناہ نظر آتی تھی۔ مذہب عوام کے لئے نیند کی دوا کا کام کر رہا تھا۔ اور ظاہر ہے ایسا مذہب انسانی ذہن کو بلندی یا روشنی دینے کی بجائے صرف ڈھونگ رچانا سکھاتا ہے۔ بت پرستی اور بے کار کے عقیدے لوگوں کو حکم کا پابند اور فرماں بردار بنائے رکھنے کا بہترین طریقہ تھے۔ سادھو سنت، اور دھرماتما قسم کے لوگ عجیب عجیب طرح کے لبادے پہن کر انسان کی ذہنی اور روحانی ترقی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی بجائے ان میں تعصب اور دوری پیدا کرنے کا کام انجام دے رہے تھے۔

پوری طرح جان بوجھ کر انگریزوں نے عوام میں فرقہ واری تصور کو بھی ہوا دی۔ اس ملک میں جس میں صدیوں سے الگ الگ مذہب، فلسفے اور رہن سہن کے ماننے والے آپسی جھگڑوں ٹنٹوں کے باوجود پورے سکون اور آپسی بھائی چارے کے ساتھ رہتے چلے آرہے تھے، انگریز انہی کے درمیان آپسی شبہے اور نفرت کے بیج بودینے میں کامیاب ہوچکے تھے۔ اپنے معاملات میں اورنگ زیب جیسے کٹر شہنشاہ نے بھی کم سے کم عوام کو تقسیم کردینے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن چونکہ انگریزوں کو ہندوستانیوں کی خوشحالی یا بہتری کے بجائے ایک ایسے ملک سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرلینے میں دلچسپی تھی جس میں پیداواری ذرائع بہت اچھے تھے اس لئے انھوں نے ہندوستان کو اپنے تاج کا "ہیرا" بنالیا۔

پوری قوم کے دل ٹوٹ چکے تھے اور لوگ ایک گہری مایوسی میں مبتلا تھے۔ ہر طرح کی بدعنوانی اور گڑبڑ پھول پھل رہی تھی۔ مذہب کی اصلی روح ویدوں اور شاستروں میں چھپے حقیقتوں کے انمول خزانے اس افراتفری میں نہ جانے کہاں کھوئے جاچکے تھے۔ "ٹھگی" جیسی مذہبی تنظیم جس میں چور، لٹیرے اور قاتل ہی ممبر ہوتے تھے، ستی کی ظالمانہ رسم، دودھ پیتے بچوں کو ختم کرنا، ایسے ہر طرح کے جرموں کو دھرم کے نام پر چھوٹ ملی ہوئی تھی۔

راجہ رجواڑوں کے صدیوں پرانے آپسی جھگڑوں نے ان کے دلوں سے بدیسیوں کے قبضے کے خلاف کھڑے ہوجانے کی خواہش اور طاقت دونوں کو چھین لیا تھا اور نام کے یہ حکمراں جن کے پاس اب نہ کوئی طاقت تھی نہ اقتدار انگریزوں کی فرمانبرداری کے بدلے میں ملی عیش وعشرت کو ہی جی جان سے پسند کرتے تھے۔

دیانند جی متھرا کے ایک انجان سے آشرم سے نکل کر ڈرامے کے اس سین میں سیدھے داخل ہوگئے۔

ہندو تہذیب میں ویدوں کو جو بلندی اور امتیاز حاصل تھا اسے دوبارہ واپس لے آنے کے عہد کے ساتھ یہ نوجوان سادھو اس وقت تنہا کھڑا تھا اور اس کے چاروں طرف بت پرستوں اور کٹر پنتھی لوگوں کا راج تھا۔

مجاہد

مجاہد دیانند نے اپنے لئے جو راستہ چنا تھا اس میں کسی مددگار کے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہندو، مسلمان، عیسائی سب ہی اس مصلح یا سماج سدھارک کے خلاف تھے۔ اس کے پاس گہری سمجھ بوجھ، سچائی، بے خوفی اور اپنے علم کی دولت کے علاوہ اور کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔

دیانند نے اپنے وقت کے بڑے بڑے ودوانوں سے پہلی بار بھڑنے کے لئے

اپریل 1868 میں کمبھ کے میلے کا چناؤ کیا، یہ خود بڑی اہم بات تھی چونکہ کمبھ ہی ہندوستان بھر میں ہندوؤں کا واحد ایسا میلا ہوتا ہے جس میں ہر طرح کے اور ہر طرف کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ عام لوگ اور پنڈت کیا کہیں گے اور ان پر اس کا کیا اثر ہوگا اس نوجوان سنیاسی نے بولنا شروع کردیا۔ اور پھر آہستہ آہستہ ان کے چاروں طرف لوگ جمع ہونے شروع ہوگئے۔ شروع شروع میں صرف ایک نئی بات کے تجسس میں، اور پھر اچھی طرح سمجھتے اور پسند کرتے ہوئے۔ بہرحال، لوگ ان کی تقریریں سننے بہت بڑی تعداد میں جمع ہونے لگے۔

اور پھر امید کے مطابق دیانند کی للکاریں وہاں پہنچ گئیں جہاں پہنچانے کے مقصد سے وہ کھڑے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے پنڈتوں اور عالموں نے انھیں بحث مباحثے یا مناظرے کی چنوتیاں دینی شروع کردیں۔ چونکہ وہ اپنی منزل یا نشانے کو بہت اچھی طرح پہچانتے تھے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ یہی لوگ ہیں جن سے انھیں صحیح معنوں میں مقابلہ کرنا ہے اس لئے وہ ہر اس شخص سے مقابلہ کے لئے تیار ہوگئے جس نے انھیں للکارا۔

دیانند جی نے ایک کے بعد ایک امبادت، اور ہری ولبھ، جیسے شاستریوں اور ودّوانوں کو میدان میں چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ اور پھر اس نوجوان سادھو سنت کے علم وفضل کے رعب میں ان لوگوں نے بھی ویدوں کے راستے کو اپنالیا۔ آہستہ آہستہ ان کے معتقدوں اور چاہنے والوں کا قبیلہ بڑھتا چلا گیا۔ ان میں اپنے وقت کے بڑے بڑے راجا اور راجکمار بھی شامل تھے۔

ہندوستانی زندگی میں ویدوں کی تعلیم کو بنیاد بنانے کے خواب کو ذہن میں بسائے انھوں نے دور دور تک دورے کیے۔ کانپور جیسے شہروں میں تو لوگ ہزاروں کی تعداد میں اس دلچسپ اور انوکھی سوچ رکھنے والے شخص کے بیان اور تقریریں سننے کے لئے جمع ہوجاتے تھے۔ اس شخص کے متواتر بڑھتے ہوئے اثر سے گھبراکر کانپور کے بڑے بڑے

ودوانوں نے تو شاستروں پر ان سے بحث اور مناظرہ بھی کیا۔ اور شہروں کی طرح یہاں بھی یہ مناظرہ گنگا کے گھاٹ پر ہی ہوا۔ اپنی منطق اور لاجواب قسم کی گفتگو سے دیانند نے ان لوگوں کو بھی قایل کردیا اورانھیں مجبور ہوکر ان کی دلیلوں کی سچائی کو ماننا پڑا۔ بت پرستی اور رسموں کی پابندی پر دیانند کے شدید حملوں کا ان شاستریوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

یہی کہانی وارانسی (بنارس) میں بھی دہرائی گئی اور نتیجے میں کاشی کے راجا کو دیانندجی سے بڑی عقیدت پیدا ہوگئی۔ یہاں بھی کئی مباحثے ہوئے اور ظاہر ہے ان میں یہ نوجوان سوامی ہی جیتے۔۔۔ نتیجے میں سچے ویدک دھرم کے جھنڈے کے نیچے بہت بڑی تعداد میں لوگ شامل ہوگئے۔

مدتوں سے چلے آرہے رسموں رواجوں اور خود اپنے بنائے ہوئے دھرم کے قانونوں پر دیانندجی کے اس اچانک حملے سے ان کے بہت سے دشمن بھی پیدا ہوگئے۔ حالانکہ ان کی تعداد دیانند سے عقیدت رکھنے والوں کے مقابلے میں کافی کم تھی لیکن ان کے پاس طاقت تھی اس لیے وہ ان کے کٹر دشمن ہوگئے۔

سمجھ بوجھ اور شعور کی یہ نئی آواز جو سارے ملک میں پھیلتی جارہی تھی اسے خاموش کردینے کی بہت سی کوششیں بھی ہوئیں۔

دوسری طرف اسی دور میں ہندوستان کے سیاسی افق پر انقلاب کے بادل بھی جمع ہونے شروع ہوگئے تھے۔ 1857 میں پہلی جنگ آزادی، جسے بغاوت کا نام بھی دیا گیا، اس کے رہنماؤں میں سے نانا صاحب بھی ایک ممتاز رہنما تھے، وہ دیانندجی کے بیانوں کو سنتے تھے اور ان سے اپنے عزم اور ارادوں کو مضبوط کرتے تھے۔"

پھر جیسے جیسے بغاوت نے برطانوی حکومت کی بنیادوں کو ہلانا شروع کیا ہندوستانیوں کے دل ودماغ میں ایک دوسری جنگ بھی تیزی سے جڑپکڑتی گئی۔ گوکہ ظاہر میں یہ جنگ کسی کو نظر نہیں آئی تھی مگر موجود ضرور تھی اور بہت سخت تھی۔ یہ مقابلہ تھا دلیل یا سمجھ

بوجھ کا، حماقت اور اندھی تقلید کے درمیان، سچائی اور دھوکے بازی کے درمیان، ویدوں کی سچائی یا پاکیزگی اور دھرم کے ظاہری دعووں کے درمیان۔

اسلام، عیسائی مذہب اور سکھ دھرموں کے مقدس بیانات بھی دیانندجی کے ذہن میں کھٹکتے تھے۔ اسی لیے قرآن شریف کو سمجھنے اور اس کی تفسیر بیان کرنے کے سلسلے میں بھی کچھ مسلمان رہنماؤں کو اعتراض پیدا ہوا۔ ظاہر ہے، یہ قدرتی بات تھی۔ کچھ کٹر قسم کے مخالف تو ان کے ان بیانوں سے اتنا اکھڑ گئے کہ ایک بار انھیں دریا میں پھینک دینے کی کوشش بھی کی گئی۔ لیکن محنت مشقت اور ریاضت سے بنا ہوا ان کا ٹھوس جسم ان حملہ آوروں کی طاقت سے زیادہ مضبوط نکلا۔ انھوں نے حملہ آوروں کو اتنی مضبوطی سے پکڑلیا کہ وہ خود بھی پانی میں کھنچے چلے گئے۔ کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ انھوں نے ان حملہ آوروں کو اس وقت چھوڑا جب وہ بالکل ڈوبنے والے تھے اور خود پانی میں پدم آسن لگاکر بیٹھ گئے۔ یہ ان کی یوگا کی ریاضت کا چمتکار رہا ہوگا۔

عام لوگوں میں ان کے بارے میں ایک کہانی بریلی کے کمشنر سے ایک جھڑپ کی بھی مشہور ہے۔ کمشنر صاحب مذہب کی کمزوریوں پر دیانندجی کے متواتر حملوں سے کچھ زیادہ پریشان ہوگئے اور انھوں نے سادھوجی سے زرا سختی سے کہلوادیا کہ اگر انھوں نے اپنی تقریروں میں ان اعتراضوں کا سلسلہ بند نہیں کیا تو کمشنر صاحب پوری کمشنری میں ان کی تقریروں پر پابندی لگادیں گے۔ اس دھمکی کا دیانندجی پر کیا اثر ہوتا، انھوں نے اگلے دن اس سے بھی سخت حملہ کیا اور کچھ اور زیادہ شدید بیان دیے۔

ہندوستانی سیاست پر دیانندجی کا جو گہرا اثر پڑرہا تھا۔ اس کو محسوس کرتے ہوئے بھی انگریزوں کی ہمت نہ پڑی کہ وہ ظاہر بظاہر ان کے کاموں میں دخل دیں۔ بہرطور وہ بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ اس دھرماتما اور تبلیغ کرنے والے کے انقلابی خیالات ایک ایسا طوفان ضرور کھڑا کرسکتے ہیں جو اپنی رَو میں ان کی حکومت کو بھی بہالے جائے۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دیانندجی کے معتقد صرف ان کے اپنے فرقے میں ہی نہیں تھے مسلمان، عیسائی، جین اور بدھ مت کو ماننے والے بھی اس نئی آواز کو جو پورے ملک میں پھیلتی جارہی تھی بڑے غور سے سنتے اور اس کا احترام کرتے چونکہ یہ آواز سمجھ بوجھ اور عقلی دلیلوں پر قائم تھی۔ جیسا کہ جنرل رابرٹس نے کہا تھا "آپ بڑے نڈر انسان ہیں۔ جب آپ عیسائیت کے بارے میں اس لہجے اور ان لفظوں میں بات کہہ سکتے ہیں، تو ظاہر ہے اور کون آپ کو خوفزدہ کرسکتا ہے۔۔۔"

ویسے حقیقت یہ ہے کہ دیانندجی تمام مذہبوں کی عزت کرتے تھے۔ ان کے اعتراضات کے کانٹے اصل میں تمام مذہبوں کی ان بے کار اور ظاہری رسموں کے خلاف تھے جنھوں نے، ان کے خیال میں، ان مذہبوں کی اصلی روح کا گلاگھونٹ کر رکھ دیا تھا۔

انسانوں اور خطرناک جانوروں سے مقابلے میں مرتے مرتے بچ نکلنے کی بہت سی کہانیاں دیانندجی کے بارے میں سنی جاتی ہیں۔ انھیں میں ایک یہ روایت بھی سنی جاتی ہے کہ ایک بار کسی جنگل کی چھوٹی سی وادی میں دیانندجی آرام کرنے کے لیے رک گئے تھے اور ان کی بھوک پیاس کو دیکھ کر کچھ جانور ان کے لیے شہد کا چھتا لے آئے تھے۔ ہوسکتا ہے ان کہانیوں میں سے کچھ مصنوعی بھی ہوں یا کچھ بڑھا چڑھا کر بیان کی گئی ہوں، لیکن ان سے اس عزت و احترام کا ضرور اندازہ ہوتا ہے جو عام لوگوں کے ہر طبقے میں انھیں حاصل تھا۔

آخری وار

جب اتنے دشمن ہوں تو کبھی نہ کبھی تو کسی کا وار کامیاب ہوہی جاتا، حالانکہ اس وقت تک سوامی دیانند ایک مدت سے کچلے اور پچھڑے ہوئے عوام کے خاصے بڑے حصے میں شعور کی جوت جگا چکے تھے۔ بہر حال، وہ بڑا افسوسناک حادثہ تھا جب ایک دن ایک

قاتل کا وار چل گیا اور عقل اور سوجھ بوجھ کی یہ آواز ہمیشہ کے لیئے خاموش ہوگئی۔

1883 میں دیانندجی جودھپور کے راجا یشونت سنگھ کے مہمان تھے۔ راجا دیانندجی کا بڑا معتقد تھا اور اس نے اپنے محل میں مختلف فرقوں اور دھرموں کے لوگوں کے ساتھ دیانندجی کا مقابلہ اور مباحثہ بھی کروایا تھا۔

ایک دن دیانندجی نے دیکھا کہ راجا یشونت سنگھ ایک پالکی میں ایک اجنبی عورت، ننھی جان کے ساتھ چلے آرہے ہیں۔ دیانندجی کے پوچھنے پر راجا نے اقرار کرلیا کہ وہ ان کی داشتہ ہے۔ اور بس اسی وقت سے دیانندجی نے اس بات کو اپنا فرض قرار دے لیا کہ راجا کو ایسی عورتوں سے تعلقات رکھنے کے سلسلے کو ختم کرنے پر مجبور کردیں۔ جلدی ہی ان کے تیکھے جملوں نے اپنا اثر دکھایا اور راجا یشونت سنگھ نے ننھی جان سے اپنے تعلقات توڑ لیے۔

چوٹ کھائی ناگن کی طرح اس عورت نے بھی دیانندجی سے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ ننھی جان نے سب سے پہلے دیانندجی کے رسوئیا (باورچی) کو اپنے ساتھ ملایا اور اس کی مدد سے اس سنت کو زہر دلوایا۔ چونکہ زہر کو شیشے کے سفوف میں ملاکر دیا گیا تھا اس لیے اس کا اثر بڑا مہلک ثابت ہوا۔ حالانکہ راجا یشونت سنگھ نے اپنے علاقے کے بہترین طبیبوں اور ڈاکٹروں سے علاج کروایا اور باہر سے بھی ڈاکٹروں کو بلایا، مگر ان کی حالت بگڑتی ہی چلی گئی۔ مہاراجا پرتاپ سنگھ کے خاص ذاتی حکیم علی مردان خان نے دیانندجی کی اس ناقابل برداشت بے چینی کی صحیح وجہ بتائی۔ جب راجا یشونت سنگھ کو اس پوری سازش کا پتہ چلا تو انھوں نے اس سازش کے تمام مجرموں سے اس کا بڑا بھیانک انتقام لینے کی قسم کھائی۔

لیکن دیانندجی نے اسی رات اس رسوئیے کو اپنے پاس بلایا اور اس سے پوچھا۔ وہ پہلے ہی سے ڈر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی حرکت کو قبول لیا۔ دیانندجی نے اسے اس حکومت کو فوراً چھوڑ دینے کا مشورہ دیا۔ کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ انھوں نے وہاں سے نکل

جانے میں اسے مدد بھی دی۔

چونکہ انھیں اس کا احساس تو ہو ہی چکا تھا کہ اب ان کا آخری وقت آچکا ہے اس لیئے انھوں نے سوچا کہ میری جان تو جا ہی رہی ہے اس کے بدلے میں ایک اور جان کیوں جائے۔ بہر طور، کئی دن تک شیشے کے سفوف نے ان کے پیٹ میں ایک آگ سی لگائے رکھی اور وہ تڑپتے رہے۔

اور پھر شدید بے چینی کے عالم میں جب کئی دن بعد وقت آخر آ ہی گیا اس وقت بھی دیانند جی کو ایک ہی غم تھا کہ انھیں ویدوں کی خالص اور سچی تعلیم کو پھیلانے کے لیے پورا وقت نہ ملا۔ بہر حال، 30 / اکتوبر 1883 کو شام کے کوئی چھ بجے یہ مضبوط اور سچی آواز آخر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔

حق کی طاقت

سوامی دیانند کے فلسفے کا نچوڑ یا جوہر ان کی کتاب "ستیارتھ پرکاش" میں ملتا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے مختصر مگر مکمل طور پر مذہب، سماج، سیاست، اخلاق اور تعلیم وغیرہ پر اپنے خیالات کو پیش کیا ہے۔ اس میں انھوں نے ویدوں کے فلسفے اور ان میں بیان کیے ہوئے زندگی کے طور طریقوں کی روح کو نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔

سوامی دیانند جی کے اپنے الفاظ میں انھوں نے اپنی زندگی بھر میں حاصل کی ہوئی ساری تعلیم اور تجربات کو اس کتاب میں اس لیے نہیں سمودیا ہے کہ اس سے کسی ایک شخص کے جذبات کو بھی ٹھیس پہنچے، بلکہ... انسان کو غلط یا "استیہ" کے مقابلے میں صحیح یا "ستیہ" کو پرکھنا آجائے..."

مذہبی رسمیں، جن میں صرف ظاہری پابندیاں اور کٹرپن سب سے اہم حیثیت رکھتا تھا، دیانند جی کی نگاہ میں سب سے زیادہ کھٹکتی تھیں۔ اس لیے انھوں نے لوگوں کی ایک

ایک رسم یا ایک ایک عقیدہ کو اٹھایا اور اسے جھٹلا کر ختم کیا۔ اصل میں ان کا مقصد تھا ویدوں کے بتائے سچے نظام کو قائم کرنا۔

ویدوں کے مقدس نغموں میں ہمارے پُرکھوں نے اپنے وقت کے حالات اور کیفیتوں کو بیان کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان نغموں میں فطرت کی ان ساری بنیادی طاقتوں اور توانائیوں کا بیان ہے جو ہمارے بزرگوں نے محسوس کی تھیں۔ یہ نغمے انسان کی منچلی طبیعت اور روحانی اٹھان کا شاید سب سے پہلا اور اچھوتا اظہار ہیں جنھیں ان روشن دماغ لوگوں نے دنیا میں سب سے پہلے الفاظ کا لباس پہنایا تھا۔ وید ہی انسان کی سب سے پہلی ایسی کوشش تھی جس میں اس دنیا میں اس نے خود اپنی، یعنی انسان کی، جگہ اور حالات کو دیکھنے اور سمجھنے کی طرف قدم بڑھایا تھا۔ یوں تو ویدوں کو روایتی اعتبار سے آسمانی یا الہامی بیان (سُرتی) مانا جاتا ہے، لیکن ویدوں نے قدرت کے قانونوں اور دنیا میں نظر آنے والے نظام کو سمجھنے کے لیئے عقل اور سمجھ بوجھ کے ساتھ تلاش اور جستجو کا طریقہ پیش کیا تھا اور ابتدائی انسان کو اس طرف سوچنے کے لیے ایک راستہ دکھایا تھا۔

"ستیارتھ پرکاش" کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ ہندی میں لکھی گئی ہے۔ یہ اس لیے اور بھی حیرت ناک بات لگتی ہے کہ ہندی دیانندجی کی اپنی زبان بھی نہیں تھی اور وہ اسے "آریا بھاشا" کہا کرتے تھے۔ ان کی مادری زبان گجراتی تھی اور ان کی ساری تعلیم سنسکرت میں ہوئی تھی اور یہی اس وقت پڑھے لکھے لوگوں اور عالموں فاضلوں کی زبان مانی جاتی تھی۔

"ستیارتھ پرکاش" کو اس زبان میں جو اس ملک کے کروڑوں لوگوں کی زبان تھی یعنی ہندی میں لکھا گیا، یہی بات سوامی دیانندجی کی عوام پسندی اور تمام لوگوں کو اپنے ذہن میں برابر جگہ دینے کی خصوصیت کو پوری طرح اجاگر کرتی ہے۔ ان کی کبھی یہ خواہش نہیں ہوئی کہ وہ ایک بڑی علمی کتاب لکھ دیں جس پر بوڑھے ودوان بیٹھے اپنی مغزپچی کرتے

رہیں۔ وہ تو اپنی تقریر اور تحریر دونوں کے ذریعے عام آدمی کے دل ودماغ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اور بہر حال وہ اس میں کامیاب رہے۔

کتاب میں سب ملاکر چودہ باب ہیں۔ ان میں "اوم" اور بھگوان کے دوسرے نام بچوں کی پرورش برہمچاریہ۔۔ تجرد یا کنوارا پن، استاد اور شاگرد کے فرائض اور اچھی بری کتابیں، شادی اور شادی شدہ زندگی، رہبانیت یا سنیاس اور دنیا سے تیاگ، راج دھرم، یعنی حکومت کا طریقہ، وید اور بھگوان، دنیا کی پیدائش، پرورش اور خاتمہ، علم اور جہالت، غلامی اور آزادی، ہندوستان کے عام مذہب اور فرقے، چارواک، بدھ اور جین مت، عیسائیت اور اسلام جیسے عنوانوں کے باب شامل ہیں۔ کتاب ویدوں کے مختصر بیان اور ان کے مطابق زندگی گزارنے کے طریقوں پر ختم ہوتی ہے۔

اپنے وعظوں کی طرح دیانند جی کی کتاب میں بھی مختلف مذہبوں اور پنتھوں میں اس دور میں مانے جانے والے ان عقیدوں اور تصورات کو ایک ایک کرکے اٹھایا گیا ہے جنھوں نے ہندوستان کے لوگوں کو بہت سے ٹکڑوں میں بانٹ رکھا تھا اور ایک ایک خیال کو گرما گرم بحث کے بجائے خالص عقلی دلیلوں کے ذریعے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیانند جی کی دلیلیں بالکل سیدھی اور دو ٹوک ہیں۔

آخر میں پوری بحث کے نتیجے کے طور پر دیانند جی کہتے ہیں۔ "میں ایک ایسے دھرم کو سچا مانتا ہوں جس کی بنیاد ساری دنیا کے (سچے) اصولوں پر ہو۔ ایسے اصول جو وقت کی کسوٹی پر پرکھے جاچکے ہوں اور اس وجہ سے یہ تصور یا سوچ تمام گھرے ہوئے یا محدود مذہبوں سے بالاتر ہے ۔۔۔ میں کسی مذہب کا پرچارک نہیں ہوں کسی مذہب میں جو بات بھی غلط یا اعتراض کے قابل ہے وہ غلط ہے، چاہے اسے کسی دھرم یا کسی ملک کے لوگ مانتے ہوں یا اس کے دعوے دار ہوں۔۔۔"

ایک نمونے کے انسان کے لئے سوامی جی کا تصور تھا۔ "صرف اس شخص کو انسان

کہا جاسکتا ہے جو فکر رکھتا ہو یا سوچتا ہو اور دوسروں کا بھی اتنا ہی پاس اور احساس رکھتا ہو جتنا اپنا، جو ناانصافی کو سہارا یا پشت پناہی نہ دیتا ہو، اور صرف حق اور نیکی کی قدر کرتا ہو۔۔۔"

چند لفظوں میں زندگی اور زندگی کے فلسفے کے بارے میں دیانندجی کے خیالات کو اپنشد کے اس ٹکڑے سے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔

"یاد رکھو کہ اگر دنیا میں سچ کے سوا کوئی بھلائی نہیں ہے اور یاد رکھو کہ اگر دنیا میں جھوٹ سے برا کوئی گناہ نہیں ہے، تو پھر انسان کو ہمیشہ سچ کے راستے پر چلنا چاہیے۔"

آریہ سماج

جس وقت سوامی دیانند سرسوتی نے ہندوستان سماج کی برائیوں اور کمزوریوں کے خلاف جنگ چھیڑی اس وقت راجا رام موہن رائے کی برہمو سماج اور کیشب چندر سین کی پرارتھنا سماج جیسی تنظیمیں پہلے ہی سماجی کام شروع کر چکی تھیں۔ ان تنظیموں اور ان کے قایم کرنے والوں نے اب تک کافی اچھا کام کرلیا تھا۔ راجا رام موہن رائے "ستی" اور دودھ پیتے بچوں (لڑکیوں) کو ختم کردینے جیسی رونگٹے کھڑے کردینے والی رسموں کے خلاف ایک انتھک جنگ شروع کر چکے تھے۔ لیکن دیانندجی کا کہنا تھا کہ یہ تنظیمیں اپنے بنیادی مقصد میں ہی کافی پیچھے رہی ہیں۔ صرف یہی نہیں، ان کا خیال تھا کہ یہ جن باتوں پر زور دے رہی ہیں وہی غلط ہیں۔ انھوں نے ان اصلاحی تنظیموں کا جی کھول کر مذاق اڑایا۔ ان کے خیال میں مغربی اصولوں کو اپناکر یہ سوسائٹیاں ہندوستان کے سماج اور اس کی بگڑی ہوئی ریتوں اور رواجوں کو کبھی نہیں بدل سکتی تھیں۔

ہندوستان کو دوبارہ ابھارنے کے لیے نئی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو مانتے ہوئے بھی ان کے خیالات میں یہ پوری جدوجہد کا بنیادی نکتہ نہیں تھا۔

اصل میں جس چیز کی ضرورت تھی وہ تھی ہندوستانیوں کو جگانے اور ان میں شعور پیدا کرنے کی، اس قوم کو جھنجوڑ کر چونکا دینے کی جو ذہنی اعتبار سے ایک لمبے عرصے سے غنودگی میں پڑی ہوئی تھی۔ ان کا ذہن اس سلسلے میں بالکل صاف تھا کہ ملک کے لوگوں کو ان کی بنیادوں یا جڑوں کو یاد دلانا اصلی کام ہے۔ ان ناقابل انکار حقیقتوں کو دوبارہ یاد دلانا اصلی مقصد ہے جو ان کی مقدس کتابوں یعنی ویدوں میں چھپی ہوئی ہیں، انھیں آریائی نظام کی شان وشوکت کو یاد دلانا ہے جو صرف ان شاستروں پر صحیح عمل سے ہی دوبارہ حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سوامی دیانند سرسوتی نے 1975ء میں "آریہ سماج" قایم کیا۔ اس تنظیم کی بنیاد بمبئی میں مانک راؤ کی واڑی میں 7 اپریل کو رکھی گئی۔ دیانند جی نے اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے ایک تنظیم کی ضرورت کو مان لیا۔ حالانکہ ان کی تقریروں کو سننے ملک بھر میں لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوتے تھے مگر ان کے خیال میں اتنا کافی نہیں تھا۔ اور گو کہ وہ برہمو سماج اور پرارتھنا سماج جیسی بہت سی تنظیموں کے فلسفے یا سوچ سے متفق نہیں تھے لیکن وہ ایسی تنظیموں کی اس اہمیت کو ضرور مانتے تھے کہ وہ لوگوں کے انجام یا ان کی قسمت کے فیصلے میں ضرور راستہ دکھاتی ہیں۔

دیانند جی کی کوششوں کی کامیابی اور عوام میں اس رہنما کے خیالات کے پھیلاؤ کو اس عرصے میں آریہ سماج کی کامیابی کے پیمانے سے ناپا جاسکتا ہے۔ اپنے دور کی دوسری تنظیموں یا سوسائیٹیوں کے مقابلے میں شاید آریا سماج ہی ایک تنہا ایسی تنظیم ہے جو وقت کی کسوٹی پر پوری اتر کر ہر طرح کی سماجی تبدیلیوں کو جھیلتی ہوئی اب تک باقی ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اس تنظیم نے بمبئی کے ایک انجانے سے گوشے میں قایم ہونے کے بعد سے اب تک ہندوستان کی کئی نسلوں کی زندگیوں کو ایک نئے ڈھنگ میں ڈھال دینے میں کوئی معمولی کردار ادا نہیں کیا۔

سوامی دیانند جی نے آریہ سماج کو دس بنیادی اصولوں پر قایم کیا تھا۔ سچے علم اور اس علم کی مدد سے ہم جو کچھ بھی حاصل کرتے ہیں اس کا ذریعہ صرف بھگوان ہے۔ بھگوان مٹایا نہیں جاسکتا، وہ رحیم ہے، ہر چیز کا جاننے والا (عالم کُل) اور سب کا سہارا ہے۔ صرف اس بھگوان کو ہی پوجا جاسکتا ہے، وید ہمیں سچا علم دیتے ہیں۔ ہر آریا کا فرض ہے کہ وہ انھیں پڑھے اور دوسروں کو پڑھائے خود سنے اور دوسروں کو سنائے، ہر شخص کو ہر وقت حقیقت یا "ستیہ" کو قبول کرنے اور غلط یا "استیہ" کو چھوڑ دینے کے لئے تیار ہونا چاہئے ہمارا ہر عمل "دھرم" یعنی صحیح اور غلط یا "ستیہ" اور "استیہ" کی کسوٹی پر پرکھا ہوا ہونا چاہئے آریا سماج کا بنیادی مقصد تمام انسانوں کی جسمانی، روحانی اور سماجی اٹھان یا بہتری ہے، تمام انسانوں کے ساتھ محبت، انصاف، بھلائی اور ان کی صلاحیتوں کے اعتبار سے ان کی قدر کرنی چاہئے۔ دنیا سے جہالت کو ختم کرکے علم اور شعور کو پھیلانا چاہئے، ہر شخص کو صرف خود اپنی بہتری اور خوشحالی کی طرف نہیں اپنے ساتھیوں اور تمام لوگوں کی بہتری کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہئے۔ اور ان مقامات میں جن کا تعلق ہمارے پورے سماج سے ہوتا ہے ان میں کسی ایک شخص کے مقابلے میں پورے سماج کی بھلائی اور بہتری کو نگاہ میں رکھا جانا چاہئے۔

ان سیدھے سادے اصولوں کی سچائی ہی اصل میں ان کی اصل طاقت ثابت ہوئی۔ پھر کیا تعجب کہ دیانند سرسوتی کے قائم کیے ہوئے آریہ سماج نے ہندوستان کے ہر گوشے میں ایک صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصے میں سوسائٹی پر بڑا گہرا اثر پیدا کردیا۔

قابل غور

ان حالات کی روشنی میں کون اس حقیقت سے اختلاف کرسکتا ہے کہ دیانند سرسوتی نئی ہندوستانی قوم کے بانیوں یا رہنماؤں میں سے نہیں تھے۔ اس ملک میں جہاں آپسی

مخالفتوں اور توہمات نے سارے سماجی ماحول کو چاروں طرف سے گھونٹ کر رکھ دیا تھا، اس انتھک مصلح یا پرچارک کی کوششوں نے ملک اور قوم میں ایک نئی توانائی پیدا کرنے کے لیے ان کے سیدھے سادے اور اچوک نسخے نے ان لوگوں میں ایک نیا شعور یا جاگرتی پیدا کردی جن کے ذہن بدیسی حکومت کے غلام ہوچکے تھے۔

اندھ وشواس اور ہٹ دھرمی کے خلاف عقل اور سمجھ بوجھ کا، غلط یا "استیہ" کے خلاف صحیح یا "ستیہ" کا یہ علمبردار اس کٹھن راہ میں کامیاب ہوگیا جہاں بڑے بڑے بادشاہ اور شہنشاہ ناکام رہے تھے۔ ان کی زندگی بھر کی جدوجہد میں ان کے پاس صرف ایک ہتھیار تھا۔۔ جرات وہمت۔ جسمانی اور اخلاقی دونوں۔۔ اور ایک بے روک ٹوک جذبہ۔ دیانندجی کے اپنے الفاظ میں۔ "میں نے ایک عالم گیر حقیقت یا سچ کی تعلیم دینے کی کوشش کی ہے اور دنیا بھر کے انسانوں کو ایک ایسے دھرم میں داخل ہوجانے کی دعوت دی ہے کہ جس میں وہ نفرت اور ایک دوسرے کی تحقیر کرنا چھوڑ کر اپنی تمام صلاحیتوں کو خدا اور انسان سے محبت کی طرف موڑ دیں اور پوری دنیا کے انسانوں کی خوشحالی کی کوشش میں جٹ جائیں۔ بھگوان کی کرپا سے اور ایسے سچے، ایماندار اور سمجھدار عالموں کی مدد سے جو بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے اپنی زندگیوں کو تیاگ چکے ہوں، خدا کرے کہ یہ سچا دھرم زمین کے کونے کونے تک پہنچ جائے۔ اس طرح اس دنیا کے تمام لوگ نیکی کی زندگی حاصل کرلیں، انھیں دنیاوی دولت نصیب ہو اور ان کی تمام جائز خواہشیں پوری ہوتی رہیں۔ اور آخر میں وہ سکون یا نجات حاصل کرلیں۔ یہی میری زندگی کا مقصد اور یہی منزل ہے۔"

اور وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کتنا کامیاب ہوسکے، اس ثبوت کے طور پر صرف اتنی بات ہی کافی ہے کہ ان کی سوچ یا تعلیمات نے ہندوستان کے دھرموں، سماج اور سیاست پر بڑی گہری چھاپ چھوڑی۔ ہندوستان کی جنگ آزادی کے بہت سے

رہنما جیسے لالہ لاجپت رائے اور پنڈت ہنس راج سوامی دیانند جی کے سختی سے پیروکار تھے۔

آج آریہ سماج کی شاخیں پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہیں اور تعلیم کے میدان میں تو سوامی دیانند اور ان کے ماننے والوں کی دین کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ "دیانند اینگلو ویدک اسکولوں، DAVS کا جال پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ ان گنت اسپتال، کمیونٹی ہال اور لائبریریاں متواتر لوگوں کی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ ہندوستانی فکر یا فلسفے نے جو کتابیں پیدا کی ہیں ان میں "ستیارتھ پرکاش" شاید سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اور پسندیدہ کتاب مانی جائے گی۔

بہر حال سوامی دیانند سرسوتی کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ انھوں نے ایک قوم کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا۔ دیانند جی سے پہلے اور ان کے بعد کوئی نیا تپسوی یا تیاگی ایسا نہیں ہوا جس نے ہندوستان کے طرز زندگی پر اتنا گہرا اور اتنا دیرپا اثر چھوڑا ہو۔

"سورج، چاند، زمین، بارش، ہوا، اور ہر اس چیز کی طرح جسے خدا نے پیدا کیا ہے، الہٰی عقیدہ بھی سب کا ایک ہی ہونا چاہیے۔ ہر مذہب میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے۔ ہر مذہب متفق ہے کہ سچ بولنا اور چوری نہ کرنا اچھے اصول ہیں۔ اگر کوئی کھوج کرنے والا ایسے تمام سچے اصولوں کا ایک مجموعہ تیار کرسکے جو سارے دھرم مانتے ہیں تو بس وہی الہٰی دین ہوگا"

دیانند سرسوتی

رابندر ناتھ ٹیگور

سوپنا دتا

ہر جگہ میرا گھر ہے
میں اسے بے چینی سے تلاش بھی کر رہا ہوں۔
ہر جگہ میرا دیس ہے۔
میں اسے جیتنے کے لئے لڑوں گا۔
ہر گھر میں میرا سب سے قریبی عزیز رہتا ہے۔
میں اسے ہر جگہ پالیتا ہوں۔

(رابندر ناتھ ٹیگور)

رابندر ناتھ ٹیگور

رابندر ناتھ ٹیگور 7/مئی 1861ء کلکتے میں جوراسنکو میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ دیبیندر ناتھ ٹیگور اور سارادا دیوی کے بیٹے تھے۔ دیبیندر ناتھ کو محبت سے لوگ مہارشی بھی کہتے تھے۔ نو بیٹوں اور چھ بیٹیوں میں رابندر ناتھ چودھویں یا آخری سے پہلی اولاد تھے۔ ان سے چھوٹے بھائی کا نام بُدھیندر ناتھ تھا مگر ان کا انتقال بہت چھوٹی عمر میں ہی ہوگیا تھا۔

رابندر ناتھ کے دادا دوارکا ناتھ اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے اور کافی ٹھاٹھ ٹھسّے بلکہ شاہانہ انداز میں زندگی گزارتے تھے کہ لوگ انھیں شہزادے یا "پرنس دوارکا ناتھ" بھی کہتے تھے۔ وہ ملکہ وکٹوریا کی سرپرستی میں اپنے کاروبار کو بڑھانے کی غرض سے انگلستان بھی گئے تھے۔ بس ایک دن کی بیماری کے بعد اُن کا اچانک ایسے وقت انتقال ہوگیا جب وہ چاروں طرف سے قرضوں میں گھرے ہوئے تھے۔ اُن کے سب سے بڑے بیٹے دیبیندر ناتھ کی عمر اس وقت صرف ستائیس برس تھی۔

دیبیندر ناتھ اس کم عمری میں بھی بڑے مذہبی قسم کے آدمی تھے اور انھیں دنیاوی کاموں سے ذرا بھی لگاؤ نہیں تھا۔ لیکن اپنے باپ کے قرضوں کی ذمے داری کو انھوں نے اپنے اوپر ایک مذہبی فرض سمجھا۔ انھیں ایک بہت بڑے اور ملے جلے خاندان کو پالنا بھی تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے والد کے قرض خواہوں سے کچھ مہلت ضرور مانگی مگر اُن

کا ایک ایک پیسہ ادا کردیا۔ اصل میں یہی ایک اہم وجہ تھی جس کے نتیجے میں ان کے پورے خاندان نے انتہائی سیدھی سادی زندگی گزارنے کا سبق سیکھ لیا تھا۔

خوابوں کی دنیا

"ربی" جس نام سے اُن کے گھر والے انھیں پیار سے پکارتے تھے۔ اپنی ماں کو بھی بہت کم دن دیکھ سکے۔ ویسے بھی وہ ایک بہت بڑے خاندان کی کرتا دھرتا تھیں اور ان کے کندھوں پر بے حد ذمہ داریاں تھیں۔ اس لیے بچوں کی دیکھ بھال زیادہ تر ملازموں کے ہی سپرد تھی۔ چنانچہ ربی، ان سے اوپر کے بھائی سمیندر ناتھ اور ربی کا بھانجا ستیہ، ان سب کی پرورش زیادہ تر باہر کی یا مردانی حویلی میں ملازموں کی نگرانی میں ہی ہوتی تھی۔

اُن کا ایک ملازم شیام تھا جسے بچوں کے پیچھے دوڑتے پھرنے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے اپنا کام اس طرح آسان کرلیا کہ وہ ربی کو ایک کمرے میں بند کردیتا تھا۔ وہ ربی کے چاروں طرف ایک گھیرا سا کھینچ دیتا اور انھیں بڑی سختی سے ڈرا دھمکا دیتا کہ اگر انھوں نے اس دائرے سے قدم باہر نکالا تو کوئی بہت خطرناک بات ہوجائے گی۔ ربی جو رامائن سے واقف تھے انھیں یہ بھی یاد تھا کہ سیتاجی کو اپنے گھیرے سے باہر نکلنے کی کیسی سخت سزا بھگتنی پڑی تھی۔ اس لیے وہ کھڑکی کے پاس چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے۔

کئی کئی گھنٹے گزر جاتے اور ربی کھڑکی کے پاس بیٹھے بڑی بے چینی سے باہر جھانکتے رہتے۔ کھڑکی کے دوسری طرف ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس کے ایک طرف ناریل کے پیڑوں کی ایک قطار تھی۔ اور دوسری طرف ایک بوڑھا برگد کھڑا تھا۔ ربی اپنی کھڑکی کے پاس بیٹھے اس کی پھیلی ہوئی جٹاؤں کو اور ان لوگوں کو دیکھتے رہتے جو تالاب پر نہانے آتے تھے۔ انھیں باہر کی دنیا عجیب بھی لگتی اور اسے دیکھ کر مزا بھی آتا۔

اُن دنوں میں بچوں کی دنیا بڑوں سے بالکل الگ تھلگ ہوتی تھی۔ بچوں کے لیے کسی قسم کی دلچسپی کا بھی کوئی خاص سامان موجود نہیں تھا۔ نہ فلم، نہ ٹیلی وژن، نہ آج جیسے فٹ بال یا کرکٹ کے میچ۔ اس لیے غریب ربی اپنے خیالوں اور خوابوں کی دنیا میں ہی ڈوبے رہتے۔ ان کی خیالی دنیا میں جادو کے کرشمے تھے، پریاں تھیں، شہزادے تھے، راکھشس، لٹیرے اور بھوت پریت تھے۔ جو انھیں سچ مچ اصلی لگتے تھے۔ ان کے برآمدے میں ایک پرانی پالکی پڑی ہوئی تھی جو ان کی دلچسپی کا خاص مرکز تھی۔ کبھی وہ اس میں گھس کر اس کا دروازہ بند کرلیتے اور اپنے خیالوں میں مگن عجیب عجیب جادوئی نگریوں، گھنے جنگلوں، ٹھاٹھیں مارتے سمندروں اور دریا کے پُرسکون کناروں پر سیر گشت کرتے اور اس سفر کے دوران طرح طرح کی مہمیں بھی اپنی خیالی دنیا میں سر کرتے چلے جاتے۔

بہت چھوٹی عمر سے ہی ربی کو فطری طور پر قدرتی منظروں سے بڑی دلچسپی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی وہ باغ کی طرف دوڑ جاتے، اوس میں بھیگی بھیگی مخملی گھاس کو چھوتے، اور اوس کے ننھے ننھے قطروں پر پڑتی سورج کی پہلی کرنیں اور تازہ تازہ کھلتی ہوئی کلیوں کی بھینی بھینی خوشبو ان کے من کو موہ لیتی۔

اسکول

ربی 1868 میں سب سے پہلے جس مدرسے میں داخل کیے گئے اُس کا نام تھا "اورینٹل سیمیناری"۔ سمیندرا اور ستیہ نے پہلے سے ہی اسکول جانا شروع کردیا تھا۔ بہر حال، ربی کا دل اسکول میں بالکل نہیں لگتا تھا۔ انھیں لگتا جیسے وہ جیل میں بند کردیے گئے ہیں۔ گھر میں تو انھیں کم سے کم کھڑکی سے جھانکنے کا موقع مل جاتا تھا، یہاں تو یہ بھی نہیں تھا۔ اسکول کے سبقوں سے وہ اکتا جاتے۔ یوں بھی کسی کو اتنے چھوٹے بچوں کے سبقوں کو دلچسپ بنانے کا خیال نہیں آتا تھا۔ اور ظاہر ہے سبق یاد نہ ہو تو نتیجہ وہی ہے۔ کلاس

بھر کی سلیٹیں جمع کر کے سر پر رکھ کر بینچ پر کھڑے رہنا، یا پھر بید بازی۔

ٹیگور خاندان کے بچوں نے "اورینٹل سیمیناری" میں زیادہ دن نہیں پڑھا۔ انھیں جلدی ہی نارمل اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اور پھر ساتھ ہی ساتھ ربی کے ایک بڑے بھائی ہمیندر ناتھ انھیں گھر پر پڑھاتے تھے۔

لڑکوں کا دن بھر کا پروگرام بڑا بندھا ٹکا تھا۔ سب سے پہلے صبح سویرے انھیں کشتی لڑنا سکھایا جاتا تھا۔ اس کے بعد ان کے ایک استاد انھیں پڑھانے آتے۔ پھر اسکول تھا جو 10 بجے سے چار بجے شام تک چلتا تھا۔ واپسی پر ایک اور استاد انھیں جمناسٹک اور ڈرائنگ سکھاتے تھے۔ پھر اس کے بعد ایک استاد اگھور بابو انھیں سائنس پڑھانے آتے تھے۔ یہ انھیں ہڈیوں کے ڈھانچے کی مدد سے علم البدن (اناٹومی) کا سبق دیتے تھے۔ یہی انھیں انگریزی بھی پڑھاتے تھے۔ ان کے پروگرام میں اتوار کے دن بھی پوری طرح چھٹی نہیں ہوتی تھی۔ اس دن انھیں موسیقی سکھائی جاتی تھی۔ اور سائنس کے چھوٹے موٹے تجربے بھی کرنے ہوتے تھے۔ ربی کو دونوں چیزیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ خاص طور پر سائنسی تجربوں میں انھیں بہت مزا آتا تھا۔

ابتدائی نظمیں

ربی کے ایک رشتے کے بھائی جیوتی پرکاش نے انھیں سب سے پہلے بحر میں کچھ لکھنا سکھایا۔ انہی کے کہنے پر ربی نے ایک نیلی نوٹ بک کہیں سے حاصل کر لی اور پھر اچھی خاصی تیزی سے اس کے صفحے ان کی بچکانا تک بندیوں سے بھرنے شروع ہو گئے۔

سمیندر کو اپنے چھوٹے بھائی ربی کی ان کوششوں پر بڑا ناز تھا۔ اور وہ ہر آتے جاتے کو پکڑ کر انھیں سنانے بیٹھ جاتے تھے۔ ہوتے ہوتے نارمل اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کے کانوں تک اس کی اطلاع پہنچ گئی۔ انھوں نے ربی سے پوچھا کہ کیا سچ مچ وہ نظم

لکھ لیتے ہیں؟ اور انھوں نے جھینپتے ہوئے اقرار کر ہی لیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے دو مصرعے خود لکھے اور بند پورا کرنے کے لیے ربی کو دے دیے۔ اور ربی نے اسے اتنی خوبصورتی اور پھرتی سے فی البدیہہ پورا کر دیا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب خوشی سے اچھل پڑے۔

نظم اور گیت ربی کی طبیعت میں خود بخود ابھرتے تھے۔ ان کے دو بڑے بھائی ہیمیندر اور جیوتیرِیندر کو موسیقی کا بڑا شوق تھا۔ یوں بھی موسیقی اور ٹیگور خاندان کا بڑا گہرا تعلق تھا۔ ربی نے بعد میں لکھا تھا "مجھے وہ وقت یاد نہیں ہے جب میں گا نہیں سکتا تھا۔"

ہمالیہ کی سیر

ربی کو گیارہ سال کی عمر میں مقدس دھاگا (جنیو) پہنا دیا گیا۔

کچھ دن بعد انھیں پتہ چلا کہ ان کے والد ہمالیہ کی یاترا پر باہر نکلنے والے ہیں اور وہ انھیں اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اس سفر سے، باہر کی دنیا کو دیکھنے کا ان کا خواب پورا ہونے والا تھا۔ ایک اور بات بھی تھی خوشی کی۔۔۔ انھیں اپنے والد سے بہت قریب رہنے کا ایسا موقع ملے گا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ اور یوں بھی چھوٹے بچے عام طور پر باپ سے دور دور ہی رہتے تھے۔

ربی کے والد کو سب سے پہلے بول پور جانا تھا۔ انھوں نے وہاں کچھ زمین خریدی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ مراقبے یا گیان دھیان کے لیے وہ بہترین جگہ تھی۔ انھوں نے وہاں ایک چھوٹا سا گھر بھی بنالیا تھا جس کا نام "شانتی نکیتن" (سکون خانہ/گھر) رکھا تھا۔

ربی کو بھی بول پور بہت پسند آیا۔ انھیں کھلے میدان، تاڑ کے پیڑوں کی لمبی لمبی قطاریں اور دور افق کے دھندلکوں میں ڈوبتا ہوا گہرا نیلا آسمان، سب کچھ بہت اچھا لگا۔

مہارشی انھیں ہر روز صبح کو انگریزی اور سنسکرت پڑھاتے تھے اور اس کے بعد آزادی۔۔۔۔۔ خوشی، بھاگ دوڑ اور من مانی کرنے کی کھلی چھوٹ۔ نہ کوئی روک ٹوک، نہ

"جادوئی گھیرا"۔ یہاں پانی میں چمکتے سنگ ریزوں سے لے کر کل کل کرتے چشمے، ہر چیز ان کے لیے ایک نئی کھوج تھی اور ان کی جانکاری کے خزانے میں اضافہ کر رہی تھی۔ پھر جب شام کا جھٹپٹا ہونے لگتا تو ان کے والد ان کے ساتھ کھلے آسمان کے نیچے ٹہلنے نکلتے اور سارے راستے آسمان، ستاروں اور سیاروں کے بارے میں انھیں بتاتے رہتے۔

پھر مارچ کے مہینے میں وہ امرتسر گئے۔ ربی اس وقت اپنی گیارہ برس کی عمر سے کچھ زیادہ بڑے لگتے ہوں گے چونکہ انھیں یاد تھا کہ ٹکٹ کلکٹر اور ان کے والد کے درمیان بڑی بحث ہوئی، چونکہ اس کا کہنا تھا کہ ان کے لیے "پورا ٹکٹ" لیا جانا چاہیئے۔ امرتسر میں یہ دونوں روزانہ (سنہری مندر) گوردوارے جایا کرتے تھے۔ مہارشی جنھیں "سکھ شبد" اچھی طرح یاد تھے کبھی کبھی انھیں گا کر پڑھتے (شبد کیرتن) میں بھی شریک ہوجاتے تھے۔ ربی کو وہ تقدس بھرا ماحول اور ساتھ ہی پرساد کا لذیذ حلوہ اور مصری دونوں بہت اچھے لگتے تھے۔

امرتسر سے یہ لوگ ڈلہوزی گئے۔ ربی نے زندگی میں پہلی بار ہمالیہ کی شان و شوکت اور عظمت اپنی آنکھوں سے دیکھی تو وہ حیران رہ گئے۔ ان کے والد نے ان کی آمد و رفت اور گھومنے پھرنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ وہ اس بات کو پوری طرح مانتے تھے کہ اگر آپ بچے کو جسمانی اور ذہنی طور پر پوری طرح ابھرتے دیکھنا چاہتے ہیں اور اس میں خود اعتمادی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اسے پوری آزادی دینی چاہیے۔

"بن پھول"

ربی اپنی بارھویں سالگرہ کر کے کلکتہ لوٹے تھے۔ پچھلے کچھ مہینے جو انھوں نے اپنے والد کے ساتھ گزارے تھے اس عرصے میں ان میں بڑی واضح تبدیلی پیدا ہوگئی تھی۔ اب نہ ان میں وہ جھجک اور جھینپ تھی اور نہ کوئی ان پر رعب جما سکتا تھا۔ اب انھیں سینٹ زیویر اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ لیکن اس سارے عرصے میں ان کی نوٹ بکوں کی تعداد میں

اضافہ ہی ہوتا رہا۔

11 / مئی 1875 کو جب انھوں نے "ہندو میلے" میں اپنی ایک نظم پڑھی تو یہ پبلک میں ان کی پہلی حاضری تھی۔ اس وقت ان کی عمر چودہ سال تھی۔ یہ میلہ بھی 68 18 میں ٹیگور خاندان نے ہی شروع کیا تھا۔ اس میلہ کا مقصد تھا لوگوں کو یاد دلانا کہ وہ ہندوستانی ہیں اور انھیں اپنے ہندوستان کی ہر چیز۔۔۔ اپنی زبانوں، اپنی تاریخ، اپنے ورثوں، اپنی موسیقی اور آرٹ۔۔۔ سے محبت کرنی چاہیے۔ لگ بھگ اسی زمانے میں ان کی کہی ہوئی ایک نظم آج تک بھی لوگوں میں پسند کی جاتی ہے۔

"ہزار دھاگوں کی ایک ڈور سے ہمارے ہزار دل بندھے ہوئے ہیں۔
اور ہمارے ایک فرض کے لیے ہماری سو جانیں نچھاور ہیں۔"

پورے ٹیگور خاندان پر ہمیشہ سے مذہبیت، ادب، موسیقی اور قوم پرستی کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا۔

اپنے بھائیوں میں ربی جیوتیرندر اور ان کی بیوی کادمبری دیوی سے بہت محبت کرتے تھے۔ کادمبری دیوی تو بہت چھوٹی سی دلہن بن کر گھر میں آئی تھیں اور ربی کی کھیل کی ساتھی تھیں۔ شام کو جب ان کے یہاں موسیقی کی بیٹھکیں ہوتیں تو جیوتیرندر کوئی دھن دیتے اور ربی اس پر گیت یا نظم لکھتے۔ جیوتیرندر جہاں کہیں جاتے اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے جاتے۔۔۔ یہ ساتھ اس وقت بھی رہتا جب وہ پدماندی کے کنارے خاندان کی زمینوں کا معائنہ کرنے جاتے۔

جس وقت "جن انکر" نام کے ایک رسالے میں ربی کی پہلی نظم "بن پھول" (جنگل کا پھول) چھپی ہے اس وقت ان کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ جیوتیرندر بھی ڈرامے لکھتے تھے اور ان میں سے بہت سے اسٹیج پر پیش کیے گئے اور کامیاب بھی ہوئے۔ ربی اپنے بھائی کے ایک ڈرامے "ایک بابو" میں پہلی بار اس وقت ہیرو کے روپ میں اسٹیج پر

آئے جب ان کی عمر سولہ سال تھی۔ بعد میں انھوں نے خود اپنے لکھے ہوئے بہت سے ڈراموں میں سب سے اہم کردار بھی ادا کیا۔

جیوتیرندر اور ان کے سب سے بڑے بھائی دویجیندر نے جولائی 1877 سے ایک رسالہ بھی نکالنا شروع کیا۔ اس کو انھوں نے "بھارتی" کا نام دیا تھا۔ ربی اس رسالے میں سب سے زیادہ پابندی سے کہانیاں، نظمیں اور مختلف موضوع پر مضمون لکھتے رہتے تھے۔

انگلستان اور اس کے بعد

جس وقت "بھارتی" رسالہ جاری ہوا اس وقت ربی کے دوسرے بھائی ستیندر انگلستان میں تھے۔ جب وہ چھٹیاں بتانے ہندوستان آئے تو انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ ربی بھی ان کے ساتھ باہر جاکر اپنی تعلیم پوری کریں۔ ان کے والد مہارشی نے بڑی خوشی سے انھیں اجازت دے دی۔

چنانچہ 20 ستمبر 1878 کو ربی پانی کے جہاز سے انگلستان روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے کچھ مہینے برائٹن کے ایک پبلک اسکول میں پڑھا اور پھر لندن یونیورسیٹی میں داخلہ لے لیا۔ وہ "اسکوٹس" نام کے ایک انگلش خاندان کے ساتھ ٹھہرے۔ اس خاندان کے سب لوگ انھیں نہ صرف پسند کرنے لگے بلکہ انھیں اپنے گھر کا ہی ایک فرد سمجھنے لگے۔

مشہور ہنری مورلے یونیورسیٹی میں ربی کے استاد تھے۔ وہ کبھی کبھی اپنے طالب علموں سے اپنی پسند کا مضمون لکھنے کے لیے کہا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار ربی نے ہندوستانیوں کے ساتھ انگریز افسروں کی ناانصافی اور بدسلوکی پر مضمون لکھا۔ مضمون لکھ تو لیا اور اسے اپنے استاد کو دے بھی دیا مگر ربی اس خیال سے اگلے دن کلاس نہیں گئے کہ ان کے استاد کیا کہیں گے۔ مگر مورلے پر اس مضمون کا اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے اسے پوری کلاس کو پڑھ کر سنایا۔ کلاس کے دوسرے ساتھیوں نے ربی کو بتلایا۔

ربی انگلستان میں صرف ڈیڑھ سال ہی رہے مگر وہ "بھارتی" کے لیے اپنی تحریریں پابندی سے بھیجتے رہے۔ وہاں سے واپسی پر انھوں نے "ساندھیہ سنگیت" لکھی۔ جو کتاب کے روپ میں شائع ہوئی اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کتاب کے شائع ہونے کے کچھ دن بعد ہی ربی ایک شادی میں گئے۔ مشہور ناول نگار "بنکم چندر" بھی شادی میں آئے تھے۔ میزبان "بنکم چندر" کو دیکھ کر ایک ہار کے ساتھ ان کو خوش آمدید کہنے بڑھے۔ لیکن بنکم چندر نے ہار اپنے گلے سے اتار کر اس نوجوان شاعر کے گلے میں یہ کہتے ہوئے ڈال دیا کہ "یہ ہار تو ان کا حصہ ہے۔" بنکم چندر جیسے شخص کی زبان سے نکلی یہ بات ایک نوجوان کے لیے یقیناً قابل فخر بات تھی۔

عام مقبولیت

اس وقت تک رابندر ناتھ جو نظمیں لکھ رہے تھے۔ ان میں ان کی اپنی ذات کی جھلک ہوتی تھی۔ جسے داخلیت کہتے ہیں۔ ٹیگور جب اکیس سال کے تھے تو ایک صبح کو انھیں بڑا عجیب تجربہ ہوا۔ جس نے ان کے دل کی گہرائیوں کو چھو لیا۔ اس تجربے سے انھیں محسوس ہوا کہ وہ سارے عالم کا ایک حصہ ہیں۔ انھوں نے خود اسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ "میں اتفاق سے برآمدے میں کھڑا ہوا تھا۔۔۔ سورج ابھی ابھر ہی رہا تھا۔۔۔ اور بس جیسے خود بخود۔۔۔ نگاہوں کے سامنے ساری دنیا ایک عجیب سے نور میں نہا گئی۔ ہر طرف خوبصورتی اور مسرت کی لہریں اٹھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ یہ نور یہ ناقابل بیان روشنی میرے دل میں اترتی چلی گئی اور سارا عالم میرے دل میں منور ہو گیا۔۔۔ میں چھجے پر کھڑا دیکھ رہا تھا۔۔۔ ایک ایک کر کے لوگ گذر رہے تھے۔۔۔ مگر آج مجھے وہ کتنے خوبصورت لگ رہے تھے۔۔۔ ناقابل یقین حد تک خوبصورت۔۔۔ جیسے دنیا کے سمندر پر لہریں اٹھکیلیاں کر رہی ہوں۔ بہت چھوٹی عمر سے اب تک دنیا کو میں صرف اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔

مگر اب میں نے دنیا کو اپنے پورے شعور اور احساس کے ساتھ دیکھنا شروع کیا۔"

اسی دن انھوں نے "آبشار جاگ اٹھے" (اویکننگ آف دی واٹرفال) عنوان سے ایک نظم لکھی۔ اسی تجربے کو انھوں نے ایک اور نظم میں ان الفاظ میں بھی بیان کیا۔

"آج میرا دل (شعور) بے دار ہوگیا اور کائنات مجھ میں سماگئی، مجھے گلے سے لگایا"

کائنات سے اس ایکتا کا احساس ساری زندگی ان کے دل ودماغ میں رچا بسا رہا۔ اور ان کی تمام تحریروں پر اس کا اثر بھی ہمیشہ نظر آیا۔

رابندر ناتھ کی شادی مرنالنی دیوی سے 1883 میں ہوئی۔ ان کے پانچ بچے ہوئے بیلا، رانی، اور میرا لڑکیاں اور دو لڑکے رتھندرا اور سمندرا۔ ٹیگور کی مشہور کہانی کابلی والا، میں منّی کا کردار انھوں نے اپنی سب سے بڑی بیٹی بیلا کو سامنے رکھ کر ہی تخلیق کیا تھا۔ چونکہ بیلا بڑی باتونی اور پیاری سی بچی تھی۔

اب وہ دور آچکا تھا کہ رابندر ناتھ کی دلچسپیاں صرف اپنے تحریری کاموں پر ہی جمی ہوئی نہیں تھیں اب انھیں اتنا ہی خیال اپنی مادر وطن کا بھی تھا۔

انڈین نیشنل کانگریس، کا دوسرا اجلاس 1886 میں کلکتے میں ہوا، جس کے صدر دادا بھائی نوروجی تھے اس میں رابندر ناتھ نے اپنا ہی ایک گیت سنایا۔

"اپنی مادر وطن کی آواز پر

ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں"

یہ گیت سیدھی سادی بول چال کی بنگالی زبان میں لکھا گیا تھا اور ایک بہت مقبول لوک دھن میں گایا گیا تھا۔

زبردست تخلیقی صلاحیت

رابندر ناتھ کو قدرت نے لکھنے کی زبردست صلاحیت عطا کی تھی۔ انھوں نے

کہانیاں، نظمیں، گیت، ناول، ڈرامے اور مضامین ہر چیز پر قلم اٹھایا لیکن ساتھ ہی انھیں اپنی خاندانی ذمے داریوں کا بھی پورا پورا احساس تھا۔ انھوں نے اپنی خاندانی جائداد کے انتظام کا بیڑا اٹھایا اور شیلیادا گاؤں میں رہنے چلے گئے۔ شیلیادا خود تو ایک پرسکون گاؤں تھا، مگر یہ تیز طوفانی بہاؤ والے دریا پدما کے کنارے آباد تھا اس کام کی خاطر ٹیگور کو اپنی کلکتہ کی زندگی کو خیرباد کہنا پڑا۔ چونکہ ان کے بچے ابھی بہت چھوٹے تھے۔ اور مرنالنی ان کی ان گنت ذمے داریوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔

رابندر ناتھ کو گاؤں کی خاموشی اور پرسکون فضا اور سیدھے سادے کسانوں کی سیدھی سادی زندگی بہت پسند آئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ہندوستان کے دیہی علاقے کو دیکھ اور سمجھ رہے تھے۔ جیسے جیسے ان کا تعلق گاؤں کے لوگوں سے بڑھا ان میں یہ احساس بھی بڑھتا گیا کہ خود ہندوستان کی ترقی کے لیے گاؤں والوں کی خوشحالی اور ترقی کتنی ضروری ہے۔ انھیں احساس تھا کہ ہندوستان کی آبادی کا بڑا حصہ گاؤں میں رہتا ہے۔ ظاہر ہے ملک اس وقت تک کیسے ترقی کر سکتا ہے جب تک یہ لوگ آگے نہ بڑھیں۔ چنانچہ انھوں نے پوری سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا کہ ان غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی زندگی میں کیسے بہتری پیدا کی جائے۔ ظاہر ہے ان کی حقیقی ترقی انھیں صرف خیرات یا بھیک دے کر نہیں ہو سکتی تھی۔ اور یہ بات بھی صاف تھی کہ ان کے لیے صرف احساس یا کڑھنا بھی کافی نہیں تھا۔ ان کی حقیقی خدمت کے لیے ضروری تھا کہ پہلے ان کے مسئلوں اور پریشانیوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے اور پھر انھیں دور کرنے کی پوری سنجیدگی سے متواتر جدوجہد کی جائے۔

زمیندار کی حیثیت سے رابندر ناتھ کی ایک اہم کامیابی یہ تھی کہ ان کے کاشتکار اور رعیت کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ ان کے دکھ درد میں دلچسپی لیتے ہیں اسی لیے وہ ان سے بہت محبت بھی کرتے تھے۔ کافی عرصے بعد جب ایک بار بیماری کی حالت میں وہ اپنی

رعیت کے بلانے پر آخری بار ان سے ملنے گئے تو گاؤں والوں نے کہا "ہم نے اگر اپنے مسیحا کو نہیں دیکھا ہے تو کیا ہوا، ہم نے اپنے "بابو مشائی" کو تو دیکھ لیا۔"

رابندر ناتھ نے اپنی زیادہ تر کہانیاں جو "گلپا گچھا" کے نام سے چھپیں پدما ندی کے ریت کے ٹیلوں پر بیٹھ کر لکھی تھیں۔ پوسٹ ماسٹر ان کی سب سے پہلی کہانی یا افسانہ تھا۔

اسی زمانے میں ان کی دلچسپی لوک سنگیت اور عوامی ادب میں بڑھنی شروع ہوئی۔ انھیں انھوں نے اپنے بہت سے گیتوں کے لیے اپنایا بھی۔۔۔ ان میں سے ایک گیت "اے سنہری بنگال۔۔۔ میں تجھے پیار کرتا ہوں" آج بنگلادیش کا یہی قومی گیت (نیشنل اینتھم) ہے۔"

سب کچھ دیسی

کانگریس کے اجلاس میں زیادہ تر لیڈر انگریزی میں تقریریں کیا کرتے تھے۔ اسی طرح ان کے کپڑے بھی عام طور پر انگریزی انداز کے ہوتے تھے۔ رابندر ناتھ جب کلکتے میں کانگریس کے دوسرے اجلاس میں عام بنگالی پہناوا۔۔۔ دھوتی اور چادر۔۔۔ میں اسٹیج پر آئے تو لوگ دنگ رہ گئے۔

رابندر ناتھ چاہتے تھے کہ ہر شخص اپنی مادری زبان سیکھے۔ 1892 میں اپنے ایک مشہور مضمون میں انھوں نے لکھا تھا۔ "بالکل اس بچے کی طرح جو اپنی ماں کے دودھ سے سب سے زیادہ صحت مند اور مضبوط اٹھتا ہے۔ اگر انسان کی مادری زبان میں اسے تعلیم دی جائے تو اس کا دل و دماغ بھی سب سے زیادہ مضبوط بنتا ہے۔" دو سال بعد جب 94 18 میں صوبائی کانگریس کا اجلاس ڈھاکہ میں ہوا رابندر ناتھ نے صدر کی تقریر کا خلاصہ بہترین اور صاف ستھری بنگالی میں پیش کرکے پورے اجلاس میں ایک سنسنی سی پیدا کردی۔ اس کے بعد سے عوامی کانفرنسوں میں یہ ایک مستقل دستور ہوگیا کہ ان کی

کارروائی ہندوستانی زبانوں میں ہی چلتی تھی۔ انھوں نے لوگوں میں دیسی فن، آرٹ اور صنعتوں کو عام لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی غرض سے ایک سودیشی بھنڈار بھی کھولا۔ اپنے پڑھنے والوں کو اپنے عظیم ورثے کو یاد کروانے کے لیے انھوں نے ہندوستانی تاریخ کے اہم واقعات اور مشہور شخصیتوں پر بڑی شاندار نظمیں بھی لکھیں۔ ان میں سے بہت سی نظمیں "کتھاو کاہنی" میں چھپیں۔ اپنی تحریروں میں انھوں نے بار بار یہ بات یاد دلائی کہ ہندوستانی سماج کی بنیاد اسکے گاؤوں ہیں اور ان گاؤں کا اپنے پیروں پر مضبوطی سے کھڑا ہونا ضروری ہے۔

1908 میں پابنا (جو اب بنگلادیش میں ہے) میں صوبائی کانگریس کا اجلاس ہوا۔ اس میں رابندر ناتھ کو صدر چنا گیا۔ اب کی بار بھی انھوں نے بنگالی میں ہی تقریر کی۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ صدر کا خطبہ بنگالی میں پیش کیا گیا۔

شانتی نکیتن

رابندر ناتھ کا اس بات پر پکا یقین تھا کہ ملک کی ترقی کے لیے تعلیم کا پھیلاؤ ہی ایک طریقہ ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لیے جو کام چنے اس میں تعلیم کا کام بہت اہم تھا شانتی نکیتن میں بچپن میں جو آزادی کے دن انھوں نے گزارے تھے انھیں اچھی طرح یاد تھے۔ انھوں نے اپنے والد سے وہاں ایک ایسے اسکول کھولنے کی اجازت مانگی جو پرانے زمانے کے "گروکل" جیسے انداز میں چلایا جائے۔ مہارشی نے خوشی سے انھیں اسکول کھولنے کی اجازت دے دی۔

چنانچہ 22 دسمبر 1901 کو تھوڑے سے طالب علموں کا ایک اسکول کھل گیا۔ "شانتی نکیتن" نام کا گھر وہاں پہلے سے ہی موجود تھا۔ رابندر ناتھ نے لگ بھگ سات ایکڑ زمین اس طرح خریدی کہ شانتی نکیتن، اس کے بیچ میں آ گیا۔ سب سے پہلے جو دو ادارے وہاں

کھولے گئے وہ ایک لائبریری تھی اور ایک تجربہ گاہ (لیبوریٹری)۔ اس ادارے کو پوری باقاعدگی سے شروع کرنے کے لیے انھیں بہت سے پیسے کی ضرورت تھی۔ انھوں نے یہ رقم اپنے حصے کی کچھ جائداد اور اپنی بیوی کے زیور بیچ کر حاصل کی۔ ظاہر ہے اس کا مطلب تھا زندگی کی پریشانیاں۔ لیکن رابندر ناتھ خوش تھے چونکہ یہ مشکلیں اور پریشانیاں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے خود ہی چنی تھیں، کسی نے ان پر تھوپی نہیں تھیں۔

لیکن اسکول کھلنے کے ساتھ ہی ان کی زندگی میں کچھ تکلیف دہ حادثے بھی ہوئے۔ اسی سال ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ اور اس کے چھ مہینے بعد ہی ان کی ایک لڑکی رانی کا بھی انتقال ہوگیا۔ پھر 1905 میں ان کے والد بھی سدھار گئے۔ لیکن شاید سب سے شدید جھٹکا انھیں اس وقت لگا جب 1907 میں ان کا چھوٹا سا بچہ سمیندرا بھی انتقال کرگیا۔

ایک مضبوط کردار کے انسان کی طرح رابندر ناتھ نے اپنے تمام غموں کو اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپا لیا۔ اور تن من دھن سے خود کو اپنے اسکول کے کاموں میں لگا لیا۔ اس اسکول کا سب سے پہلا مقصد یہ تھا کہ تعلیم کو زندگی کا ایک ایسا حصہ بنا دیا جائے جو اس سے کبھی الگ نہ ہو۔ اس کی کلاسیں کھلے میدانوں میں پیڑوں کی چھاؤں میں ہوتیں۔ شاگرد اور استاد دونوں ایک گھر کی طرح رہتے اور زندگی کے سارے چھوٹے بڑے کام ساتھ ساتھ مل کر پورے کرتے۔ رابندر ناتھ نے کام، علم، موسیقی اور تہواروں کی مدد سے اپنے شاگردوں اور ساتھ کام کرنے والوں کا قدرت سے ایک اٹوٹ رشتہ قائم کردینے کی بڑی کامیاب کوشش کی تھی۔

گیتانجلی

رابندر ناتھ بری طرح کام میں لگے ہوئے تھے چنانچہ 1912 میں بیمار ہوگئے اور تھوڑے سے دن آرام کرنے کے لیے شیلائیڈا چلے گئے۔ اس دوران انھوں نے اپنی کچھ

نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ان کی بیماری کچھ زیادہ لمبی اور پریشان کن ہوگئی تو فیصلہ کیا گیا کہ انھیں اپنے علاج کے لیے ملک سے باہر کہیں چلا جانا چاہیئے۔ اس بیماری کی حالت میں انھوں نے پانی کے جہاز پر بھی اپنے ترجمے کا کام جاری رکھا۔

جب یہ لندن میں تھے تو انھوں نے اپنی کچھ نظمیں اپنے دوست مشہور پینٹر، آرٹسٹ، سر ولیم روتھنسٹین کو سنائیں۔ انھیں یہ نظمیں اتنی پسند آئیں کہ وہ انھیں آئرش شاعر ڈبلو۔ بی۔ ییٹس (W.B. Yeats) کے پاس لے گئے۔ اس عظیم شاعر نے ان نظموں کو بہت اعلا معیار کا قرار دیا۔ اور یہاں تک کہا کہ "پوری مغربی دنیا ٹیگور جیسے شاعر کا انتظار کررہی تھی۔"

ییٹس نے اور بہت سے لوگوں کو بلاکر یہ نظمیں سنوائیں اور لوگوں نے انھیں بہت پسند کیا۔ ان لوگوں میں سی۔ ایف اینڈریوس (C.F. Andrews) بھی تھے جنھوں نے کہا "میں اپنی ساری خدمات آپ کو پیش کرتا ہوں۔ کیا میں آپ کے کام میں خود کو پوری طرح لگا سکتا ہوں۔؟ میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔"

سی۔ ایف۔ اینڈریوس جو مغربی دنیا کے ایک مشنری کارکن تھے وہ دہلی کے سینٹ اسٹیفنس کالج میں پڑھانے آئے تھے۔ لیکن انھوں نے شانتی نکیتن میں کام کرنے کے لیے اپنی ملازمت چھوڑ دی۔ ان کے دل میں ہندوستان کے غریب اور پچھڑے ہوئے لوگوں کے لیے بڑا درد تھا۔ اس لیے ہندوستان میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ انھیں لوگوں کی مدد کرنے اور ان کی تکلیفوں کو کم کرنے کی کوشش میں لگایا۔ اسی لیے انھیں لوگوں نے محبت سے (دین بندھو) "عوام دوست" کا خطاب دیا تھا۔

انڈریوس نے اپنی زندگی کا باقی حصہ اس شاعر کے عظیم کام میں ہاتھ بٹانے میں لگایا۔ انھوں نے رابندر ناتھ کو دو اور ایسے اشخاص سے ملایا جو ساری زندگی ان کے دوست رہے۔ ایک ولی پیرسن تھے جو ہندوستان اور ہندوستان کے لوگوں کی زندگی اور کلچر سے گہری

دلچسپی رکھتے تھے۔ اور یہ رابندر ناتھ ہی تھے جنھوں نے بعد میں انھیں مہاتما کا لقب دیا تھا۔

رابندر ناتھ کی نظموں کا انگریزی ترجمہ گیتا نجلی کے نام سے 1912 میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس کتاب کی اشاعت نے مغربی دنیا کے پڑھے لکھے لوگوں میں ایک ایسی ہلچل سی پیدا کردی جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ کچھ دن بعد شاعر چند مہینوں کے لیے امریکہ گئے جہاں انھوں نے اپنشدوں اور ہندوستان کے روحانی پیغام پر لکچر دیے۔ ویسے وہ اپنی صحت کے خیال سے وہاں گئے تھے۔ اور جب وہ واپس آئے تو ان کی صحت بہتر تھی۔

1913 میں رابندر ناتھ کو گیتا نجلی کے لیے ادب کا "نوبیل پرائز" دیا گیا۔ یہ پہلے ایسے ایشیائی تھے جنھیں اس انعام سے نوازا گیا تھا۔ اس بات کے کہنے کی شاید کوئی ضرورت نہیں ہے کہ انھوں نے اس انعام کی ساری رقم شانتی نکتین پر ہی خرچ کردی۔ پھر 1915 میں انھیں انگلستان میں "سر" یا "نائٹ" (Knight) بنائے جانے کا اعزاز بھی ملا۔

وشوا بھارتی

1918 میں رابندر ناتھ دو شدید حادثوں سے بھی دو چار ہوئے۔ ولی پیرسن پر، جو ان کے قریبی ساتھی اور دوست تھے بلاوجہ برطانیہ مخالف کاموں کا الزام لگاکر انگلینڈ واپس بھیج دیا گیا اور پھر ٹیگور کی سب سے بڑی بیٹی بیلا، جس سے انھیں خصوصی لگاؤ تھا بیمار ہوئیں۔ اور آخر ان کے سامنے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئیں۔ اس سے ٹیگور جیسے ٹوٹ ہی گئے۔

لیکن بجھنے یا کام میں دلچسپی کم کرنے کے بجائے انھوں نے خود کو اور زیادہ کام میں لگادیا۔ اب ایک عالمی یا بین الاقوامی یونیورسٹی قائم کرنے کے خواب نے ان کے دل ودماغ کو جکڑ لیا۔ وشوا بھارتی۔۔۔ ایک ایسی یونیورسٹی جس میں دنیا کے ہر کونے سے لوگ

آئیں، ساتھ رہیں، اور ایک دوسرے سے کچھ سیکھیں۔۔۔ اس یونیورسٹی کا سنگ بنیاد دسمبر 1918ء میں ایک بہت معمولی اور سیدھے سادے جلسے میں رکھ دیا گیا۔

کچھ مہینوں بعد ہی اپریل 1919 میں جلیان والے باغ کے قتل عام کا حادثہ ہوا۔ اور اس ہولناک حادثے کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ اس پر احتجاج کرتے ہوئے انھوں نے "سر" کا خطاب واپس کر دیا۔

وشوا بھارتی کو وہ اپنے تصورات کی ایک جیتی جاگتی مثال بنانا چاہتے تھے۔ "ہندوستان کو دنیا سے سچے اور صحیح رشتوں کے ساتھ جوڑنا ہوگا۔ اور انسانیت دنیا کی تمام سچائیوں سے بڑی حقیقت ہے۔ ہندو، بدھ، جینی، سکھ، عیسائی اور مسلمان، ہر نسل و مذہب اپنے اپنے مذہبوں کی عظیم روایات رکھتے ہیں۔ اور یہ سب الگ الگ دھارے آگے بڑھتے ہوئے ایک دھارے میں بدل جاتے ہیں۔ یعنی ہندوستان کی عوامی تہذیب کا وہ عظیم سمندر جسے کبھی الگ الگ دھاراؤں میں نہیں بانٹا جاسکتا۔۔۔ سب لوگوں کو ۔۔۔ حق ہے کہ وہ سچائی کی تلاش میں جس میں انسان لگا ہوا ہے شامل ہو جائیں۔۔۔ مشرق، مغرب میں کوئی فرق نہ ہو۔ وشوا بھارتی ہی ایک ایسی جگہ ہوگی جہاں حق کی یہ جستجو ہندوستان کو باقی دنیا کے ساتھ جوڑ دے گی۔"

یونیورسٹی قائم کرنے کے بعد رابندر ناتھ پورے ملک میں گھومے۔ مشرق، مغرب، شمال، جنوب، ہر طرف وشوا بھارتی کے پیغام کو سمجھاتے ہوئے انھوں نے ہندوستان کے تمام صوبوں سے عالموں اور طالب علموں کو وشوا بھارتی آنے کی دعوت دی۔ پھر وہ ملک سے باہر بھی گئے ۔۔۔ انگلستان، فرانس، جرمنی، ہالینڈ، بیلجیم، سوئٹزرلینڈ، آسٹریا، زیکوسلوواکیا، ناروے، سوئیڈن، امریکہ، کینیڈا، اٹلی، اسپین، چین، جاپان، مصر، ایران، عراق۔ ان کے سفر کا مقصد صرف اپنی یونیورسٹی کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنا اور دنیا کے ہر کونے سے پڑھے لکھے لوگوں اور دانشوروں کی حمایت حاصل کرنا تھا۔

اس وقت تک رابندر ناتھ کی لگ بھگ کتابیں انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ کی جاچکی تھیں۔ اس لیے وہ جہاں بھی پہنچے لوگ ان سے بڑی خصوصیت اور محبت کے ساتھ ملے۔ اس سفر میں وہ دنیا کے بہت سے بڑے بڑے عالموں، لکھنے والوں، اور دانشوروں سے بھی ملے ۔ ان میں ہنری لوئی، برگستان، سلوین لیوی، روماں رولاں، البرٹ کیسرلنگ، تھامس مان، وغیرہ شامل تھے۔ ان میں سے لیوی نے وشوا بھارتی آنے کی دعوت سب سے پہلے قبول کی۔

23 / دسمبر 1921 کو رابندر ناتھ نے وشوا بھارتی کو ملک کی عوام کے لیے وقف کردیا۔ اس ادارے کی زمین، تمام عمارتیں، لائبریری، نوبیل پرائز سے حاصل ہوئی ساری رقم اور ان کی جمع کی ہوئی ساری کتابیں بھی شامل تھیں۔ اس وقت وشو بھارتی کے مقصد کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا تھا۔ "وشو بھارتی کا تصور اصل میں حقیقت یا سچ کی پہچان اور اسے پھیلانا ہے۔۔ سچ ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے۔" اور شاعر کے اپنے الفاظ میں "یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں پوری دنیا ایک ہی آشیانے میں اپنا گھر بنا سکتی ہے۔"

وشوا بھارتی تحقیق یا ریسرچ کا بھی ایک ادارہ تھا۔ رابندر ناتھ کی زندگی میں جو شعبے ابھرے وہ تھے ودیا بھون، (1918) ، کلا بھون اور سنگیت بھون (1919) شکشا بھون (1921) سری نکیتن (1922)، چانا بھون (1931) شلپا بھون (صنعت و دستکاری کا مرکز) (1937) اور ہندی بھون (1939)۔

ان شعبوں میں "سری نکیتن" کی ایک خصوصی اہمیت ہے۔ شیلائیدا دا میں رہنے کے وقت سے رابندر ناتھ کو گاؤں کے لوگوں کے مسئلوں سے بڑی گہری دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ وہ چاہتے تھے کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو گاؤں والوں کو زراعت کے بہترین طریقے، جانوروں کی پرورش اور گاؤں کی دوسری دستکاریوں جیسے کتائی، بنائی وغیرہ کو اچھی طرح سکھائے۔ وہ چاہتے تھے کہ جس حد تک ممکن ہو گاؤں اور گاؤں والے

خود اپنے گاؤں اور ان کے کاموں پر منحصر رہیں۔ "سری" کا لفظ خوبصورتی، حسن، خوشحالی اور خوشی کا نمائندہ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ "سری نکیتن" گاؤں میں یہ چیزیں پیدا کر دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔

مصوری (پینٹنگس)

رابندر ناتھ کی ذہنی صلاحیتیں، جو فن اور ادب پیدا کرتی ہیں (جنھیں تخلیقی صلاحیتیں) کہتے ہیں ان کے رخ بہت مختلف تھے اور ان کی سوچ یا تصور اتنا ہی گہرا تھا جیسے ہماری پوری کائنات۔ انھیں خدمات نے انھیں ایک جادو جگانے والا قلم بھی عطا کیا تھا۔ چنانچہ ان کے خیالات، تصورات، خواب اور تمنائیں سب ان کی نظموں کہانیوں، ناولوں، ڈراموں، اور مضمونوں میں کھل کر ظاہر ہوئے اور یہی بات ان کے گیتوں اور تصویروں (پینٹنگ) کے لیے بھی اتنی ہی صحیح ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں تک مصوری کا سوال ہے، اس کا خیال انھیں زندگی کے آخری حصے میں آیا۔ 1930 میں جب وہ آخری بار مغرب کے سفر پر گئے تب ان کی تصویروں کی نمائش فرانس، انگلینڈ، جرمنی، ڈینمارک، روس اور امریکہ میں ہوئی۔ اس وقت تک وہ اسی (80) سے زیادہ کتابیں اور ایک ہزار سے اوپر نظمیں اور گیت لکھ چکے تھے۔ اور یہ گیت صرف بنگالیوں کے ہونٹوں کی ہی زینت نہیں تھے بلکہ ملک کے تمام گوشوں میں گائے جاتے تھے ۔۔۔ خصوصاً ان کے قومی گیت تو ہر علاقے میں مقبول تھے۔ شاعر کو اپنی زندگی میں یہ احساس بھی نہیں تھا کہ "جن، گن، من ۔۔۔" کچھ دن بعد ان کے ملک کا قومی گیت (نیشنل اینتھم) ہو جائے گا۔

رابندر ناتھ ایک نوخیز لڑکے کی عمر میں ہی برج بھاشا میں بھانو سنگھیر پداولی، نظم کر کے لوگوں کو تعجب میں ڈال چکے تھے۔ "والمیکی پرتبھا" (1881) جو ان کا پہلا موسیقی ڈراما

تھا۔ اس میں انھوں نے مشرق اور مغرب کی موسیقی کو پہلی بار بڑی کامیابی سے ملاکر پیش کیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے کئی بڑے یادگار ڈرامے لکھے۔۔۔ "وسرجن" (1890)، ڈاک گھر، (1912) رکتا کرلی، (1926) چترانگدا (1936) وغیرہ۔ ان کے بہترین ناولوں میں "گورا" (1910) "گھارے بیرے" (1916)، "یوگا یوگ" (1929) اور شیشیر کوتیا، (1929) شامل ہیں۔ ان کی خوبصورت ترین چھوٹی کہانیوں میں، کابلی والا، چھٹی، خوش دھتا پاشان، "صبح" اور "نستانیر" جیسے موتی بھی شامل ہیں۔ ان کے گیت جنھیں اب مجموعی طور پر "رابندرا سنگیت" نام سے جانا جاتا ہے، وہ ایک الگ موسیقی کی مستقل شاخ مان لیے گئے ہیں۔ اور انھیں ہندوستانی کلچر کی ایک مضبوط کڑی سمجھا جاتا ہے۔

شاعر اور مہاتما

رابندر ناتھ کا کوئی ذکر یا ان کی سوانح عمری اس وقت تک مکمل ہی نہیں مانی جاسکتی جب تک اس میں بابائے قوم مہاتما گاندھی اور ٹیگور کے خصوصی رشتے کو نہ بتایا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ سیاسی میدان میں ایک دوسرے کے کوئی بہت خاص ساتھی بھی نہیں تھے۔ اور اس کا ان دونوں نے اقرار بھی کیا تھا۔ مگر اس دوری نے ان کی آپسی محبت اور ایک دوسرے کی قدر اور عزت واحترام میں بھی کوئی فرق پیدا نہیں کیا تھا۔ جب گاندھی جی مئی 1932 میں "چرخہ پروگرام" میں انھیں شامل کرنے کی غرض سے رابندر ناتھ سے ملے تو ٹیگور نے ان سے اتفاق نہیں کیا۔ مگر رابندر ناتھ نے ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں ہر جگہ اپنی تمام تقریروں اور گفتگوؤں میں گاندھی جی کی عظمت اور ان کی انوکھی رہنمائی کا ہمیشہ دل کھول کر اظہار کیا۔

اب 1935 کا سال تھا۔ شاعر اب پچھتر برس کا ہوچکا تھا۔ ان کے کمزور کندھوں کے لیے وشوا بھارتی کا بوجھ اب برداشت کی قوت سے بڑھ رہا تھا۔ انھوں نے اس ادارے کو

اپنے خوابوں اور تصورات کا ایک جیتا جاگتا مرکز بنانا چاہا تھا۔ لیکن جیسا وہ چاہتے تھے ویسا پیسے کی کمی کی وجہ سے کر نہیں پا رہے تھے۔ اب قرض بھی بڑھ چکا تھا۔ اس کے لیے انھوں نے اس عمر میں اپنا مشہور موسیقی ڈراما چترلگاڈا، تیار کروایا اور اپنے ٹروپ کو لے کر باہر نکلے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس کی مدد سے وشوا بھارتی کے لیے کچھ رقم جمع کرلیں گے۔ چنانچہ وہ کلکتہ، پٹنہ، الہ آباد، لاہور اور آخر دلی گئے۔ بڑھاپے میں کسی ادارے کے لیے روپیہ فراہم کرنے کی غرض سے اس طرح گھومنا، اس خیال نے گاندھی جی کے اوپر اتنا اثر کیا کہ انھوں نے اپنے ساتھ کام کرنے والے معتقدوں سے ساٹھ ہزار روپیہ جمع کیا اور رابندر ناتھ کو بھیج دیا۔ یہ رقم اس وقت اتنی کافی تھی جس سے ان کے ادارے کی مالی پریشانیوں پر قابو پالیا گیا۔

دوسرے سال شاعر سخت بیمار ہوگئے۔ گاندھی جی تاروں کے ذریعے سے متواتر ان کی صحت کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔ اور دل بڑھانے والے پیغام بھیجتے رہتے تھے۔ 1940 میں وہ ایک بار پھر ان سے ملنے بھی آئے۔ جلدی ہی رابندر ناتھ نے انھیں خط بھیجا جس میں انھوں نے لکھا "اس ادارے کو اپنی سرپرستی میں قبول کرلیجیے۔۔۔ وشوا بھارتی ایک سفینہ (جہاز) ہے جس میں میری زندگی کا سارا اسباب جمع ہے۔۔۔ بہترین خزانے۔" اس کا جواب گاندھی جی نے ان الفاظ میں دیا "یقیناً وشوا بھارتی پوری قوم کا ادارہ ہے۔ بلکہ اس میں بھی شک نہیں کہ بین الاقوامی یا ساری دنیا کا ادارہ ہے۔ آپ یقین رکھیے جو کچھ بس میں ہے، میں ضرور کروں گا۔۔۔" اور گاندھی جی اپنے وعدے کو بھولے بھی نہیں۔

مئی 1942 میں انھوں نے انڈریوس میموریل فنڈ قائم کیا اور اس کے لیے پانچ لاکھ روپے جمع کردیے۔ یہ اس دوست کی یادگار کے لیے کیا گیا تھا جو ان دونوں کو قریب لایا تھا۔ انڈریوس کلکتے کے ایک نرسنگ ہوم میں اگست 1940 میں انتقال کرگئے۔ اپنے انتقال سے کچھ عرصے پہلے ہی انھوں نے جواہر لال اور مولانا آزاد تک وشوا بھارتی کے لیے اپنی پریشانیوں کا پیغام بھیجا تھا۔ بہرطور ان دونوں کی ملی جلی کوششوں سے پارلیمنٹ

نے وشوا بھارتی کو مرکزی یونیورسٹی کا درجہ دے دیا۔

صبح صادق

اپنی بیماری سے رابندر ناتھ کی جنگ جاری رہی۔ مگر موت سے ہر لمحے قریب ہوتے ہوئے بھی ان کے ذہنی سکون میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اپریل 1941 میں ان کی اسّی ویں سالگرہ بنگال کے نئے سال کے مطابق منائی گئی۔ چونکہ ان کی اصلی سالگرہ کا دن وشوا بھارتی کی گرمیوں کی چھٹی میں پڑ رہا تھا۔ یہ فنکشن خود ان کے اپنے گیت کے ساتھ ختم ہوا جس کے الفاظ تھے۔

"چوٹیوں پر صبح صادق کھل رہی ہے
اب کوئی ڈر نہیں۔۔۔ کوئی ڈر نہیں
ایک نئی زندگی کی آشا ہے
جیتا ہوا ہیرو آگیا ہے"

رابندر ناتھ ٹیگور نے 7 اگست 1941 کو آخری بار آنکھیں موند لیں۔ یہ زندگی تھی جو بھرپور انداز میں پوری نیکی اور شرافت کا نمونہ تھی اور آخر شاعر نے اپنی زندگی کے مقصد کو پہچان لیا تھا۔

"جب کوئی اپنے من کے نور میں نہا کر حقیقت کو پالیتا ہے۔
پھر کوئی اس سے اسے محروم نہیں کر سکتا۔
اس سچائی کو وہ اپنے ساتھ ساتھ لیے
اپنے آخری انعام کے ساتھ
آخری خزانوں کی طرف پلٹ جاتا ہے۔"

یہی آخری الفاظ تھے جو انھوں نے لکھے تھے۔

گووند بلبھ پنت

دیپا اگروال

"میں کہتا ہوں کہ قومیں تو خود اپنے بنائے سے بنتی ہیں، میں کہتا ہوں کہ اپنی حکومت خود بنانے کے حق کے لئے تو لڑنا پڑتا ہے۔ اسے حاصل کر کے اسے کامیاب بنانا پڑتا ہے۔ یہ چیزیں کسی ملک کو دوسرے ملک کی طرف سے تحفے میں نہیں دی جاتیں۔"

گووند بلبھ پنت

گووند بلبھ پنت

لڑکے بڑے زور شور سے فٹ بال کے کھیل میں مصروف تھے ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں چیڑ کے پتوں سے چھن چھن کر ان پر پڑ رہی تھیں مگر ایک لڑکا لمبا سا اونی کوٹ اور چوڑی دار پائجامہ پہنے کسی گہری سوچ میں ڈوبا بالکل الگ تھلگ بیٹھا ہوا تھا۔ ایک دم کچھ آوازیں ابھریں۔

"یہ فاؤل ہے!" ایک لڑکا چیخا "بالکل نہیں۔" مخالف پارٹی کے ایک کھلاڑی نے جواب دیا۔ "اب ہار رہے ہو تو یہ فاؤل ہوگیا!"

"میں بتاتا ہوں تمہیں۔ ابھی" بات بڑھ کر کافی گرم ہوچکی تھی اور بس جنگ چھڑنے ہی والی تھی کہ کسی نے کہا!

"اچھا ٹھہرو ہم تھپوا سے پوچھتے ہیں" "ٹھیک ہے ٹھیک" ہے اور دونوں ٹیمیں ایک ساتھ اس لڑکے کی طرف بڑھ آئیں جو الگ تھلگ بیٹھا تھا۔ "تھپوا تھپوا" وہ سب ایک ساتھ ہی چیخنے لگے۔ لیکن بڑی بڑی آنکھوں والے گورے چٹے لمبے تڑنگے لڑکے نے ہاتھ اٹھا کر فیصلہ سنایا۔ "یہ تو فاؤل تھا!" مگر اس کی آواز میں نرمی تھی۔ جو کچھ دیکھا تھا جب اس نے بیان کیا تو لڑکے چپ ہوگئے۔

جلدی ہی ٹیموں کا جھگڑا طے ہوگیا اور کھیل شروع ہوگیا۔ تھپوا یعنی سنجیدہ لڑکا گووند

بلبھ پنت ہی تھے اور اپنی پوری زندگی میں انھوں نے یہ ریفری یا صلح صفائی کرانے کا کردار ہمیشہ ادا کیا تھا۔ اسی لئے جب سردار ولبھ بھائی پٹیل کا انتقال ہوا تو ہندوستان کو متحد کرنے کی زبردست ذمہ داری کا کام وزیر داخلہ کی حیثیت سے گووند بلبھ پنت کو ہی سونپا گیا اور انھوں نے بھی اپنے مضبوط کردار، ذہنی سکون اور خاموشی کے ساتھ اس کام کو سنبھال لیا۔

☆ ☆ ☆

بچپن

پورے ہندوستان کی زندگی کے تانے بانے میں ہمالیہ کا ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ پہاڑوں کا یہ سلسلہ ہمارے حوصلے بڑھاتا ہے ہمیں ابھارتا بھی ہے اور دین دھرم کے لوگوں اور یاتریوں کے لئے بھی کشش رکھتا ہے۔ صدیوں سے لوگ لمبے لمبے تکلیف دہ اور جوکھم بھرے سفروں کی پرواہ کیے بغیر ان چھپے مقدس مقامات کی یاتراؤں پر نکلتے رہے۔

دسویں صدی عیسوی میں ایک یاتری کونکن (مغربی ہندوستان کے ساحلی علاقے) سے گڑھوال میں بدری ناتھ کی یاترا کے لئے آیا تھا۔ اس یاتری کا نام تھا جے دیوپنت۔۔۔ اس زمانے میں بادشاہ بھی عالموں کی دیکھ بھال اور سرپرستی کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ جے دیوپنت ایک اچھے عالم تھے۔ چنانچہ قریب کے کماؤں علاقے کے ایک راجا نے جے دیوپنت کو اس علاقے میں آباد ہوجانے کی دعوت دی۔ ادھر جے دیوپنت کو بھی پہاڑی علاقے کی خوبصورتی نے ایسا رجھایا کہ انھوں نے راجا کی دعوت قبول کرلی۔

جے دیوپنت اس علاقے میں گووند بلبھ پنت کے سب سے پہلے بزرگ تھے۔ گووند بلبھ پنت کو جواہر لال نہرو نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا "ہمارے محبوب ہمالیہ پہاڑوں کا بیٹا جس میں ان کی پوری خاموشی سکوت اور کبھی ختم نہ ہونے والا سکون بھی موجود ہے

اور چٹانوں جیسی مضبوطی بھی۔ یہ لوگوں کے ذہنوں اور راستوں کے لئے روشنی کا مینار ہے۔"

گووند بلبھ پنت 30 / اگست 1887 کو پیدا ہوئے تھے۔ یہ دن انتت چترداسی کا دن کہلاتا ہے (اس دن بھگوان کے ہمیشہ رہنے والے روپ انتت کی پوجا ہوتی ہے) ان کی پیدائش الموڑہ ضلع کی شیاہی دیوی پہاڑیوں کے ایک گاؤں کھونٹ میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام منورتھ پنت اور ماں کا نام گووندی تھا۔ منورتھ پنت سرکاری افسر تھے۔ چونکہ ان کی نوکری میں جگہ جگہ کے دورے اور بار بار تبادلے ہوتے رہتے تھے اس لئے گووند کو ان کے نانا کے پاس الموڑہ بھیج دیا گیا۔ ان کے نانا بدری دت جوشی اپنے علاقے کی جانی پہچانی اور کافی اہم شخصیت تھے اور بڑی حیثیت رکھتے تھے چونکہ وہ صدر امین تھے جو ایک طرح کا عدالتی افسر ہوتا ہے۔

گووند کو اسکول کی پڑھائی کے لئے رامسے انٹر کالج بھیج دیا گیا۔ بدری ناتھ جوشی کے تین منزلہ بھرے پُرے مکان کی زندگی میں بڑی ہلچل اور شور رہتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا ملاجلا خاندان تھا اور گووند کے کئی رشتے کے بھائی اس کے ساتھی تھے۔ گووند کے دن کی شروعات عام طور پر گھر سے کچھ دور ایک چشمہ پر نہانے کے لئے پیدل چلنے یا کبھی کبھی گھوڑسواری کرنے سے ہوتی تھی۔ کوئی پچاس آدمیوں کے لئے گھر میں کھانا پکتا تھا اور کبھی کبھی گووند کو ادھ کچرے چاول ہی کھاکر اسکول بھاگنا پڑتا تھا اسی لئے وہ اکثر دیر سے بھی پہنچتے تھے۔

بحث مباحثے

مگر دیر سے پہنچنے کی اس کمزوری کا جواب وہ اپنی پڑھائی لکھائی سے دیتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے استاد انھیں بہت چاہتے تھے۔ حساب تو ان کا من پسند مضمون تھا۔ کبھی کبھی تو وہ ایسے سوال بھی حل کر دیا کرتے تھے جو ان کے استاد بھی نہیں کر پاتے تھے۔ بحث مباحثہ

ان کا دوسرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ وہ تقریر کرنے میں بھی بڑے ہوشیار اور ماہر تھے ۔ بعد کی زندگی میں ان کی اسی خصوصیت نے وکالت کے پیشہ میں بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ ہمارے ملک کی پارلیمنٹ کے تو وہ بہترین مقرروں میں سے مانے جاتے تھے۔

بہرحال جس وقت ان کے دوست گلی ڈنڈا اور فٹ بال کھیلنے میں مصروف ہوتے تھے گووند کو کھیل دیکھنے اور ریفری ہونے میں زیادہ مزہ آتا تھا اور ان کے ساتھی ان کے فیصلوں کو مانتے بھی تھے ۔ انھیں پیدل چلنے اور گھوڑسواری کا بہت شوق تھا۔ ان کے نانا کے پاس چار گھوڑے تھے اور آس پڑوس میں شٹولی کے جنگل میں بہت سی گھومنے پھرنے کی جگہیں بھی تھیں جہاں اپنے دوستوں کے ساتھ کافل کے پیڑ پر چڑھ کے رس بھرے پھل کھانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

جغرافیائی اعتبار سے کماؤں کا پہاڑی حصہ چونکہ کچھ الگ تھلگ تھا اس لئے یہ علاقہ اپنے زمانے کی سیاسی گہماگہمی اور ہلچل سے بھی کٹا رہتا تھا۔ اونچے نیچے خراب پہاڑی راستوں کی وجہ سے دوسرے علاقوں سے آنے جانے اور خبروں کے پہنچنے میں خاصی رکاوٹ تھی اور پھر کمشنر رامسے بھی بڑے سخت انداز میں اس علاقہ پر حکومت کرتا تھا اسی لئے 1857 کی بغاوت کے شعلوں میں سے ایک چنگاری بھی چنک کر اس علاقہ میں نہیں پہنچی تھی۔ ایک اور وجہ بھی تھی یہاں کی سیاسی خاموشی کی۔ 1814 کی گورکھا جنگ کے بعد انگریزوں نے کماؤں کو اپنے قبضہ میں کرلیا تھا۔ گورکھوں نے 1790 میں کماؤں کے علاقے کو حاصل کیا تھا۔ ان کے افسر چونکہ عام طور پر بڑے سخت بلکہ ظالم ہوتے تھے اس لئے ان کے مقابلہ میں وہاں کے لوگوں کو برطانوی حکومت کچھ نرم اور کھلے دماغ کی محسوس ہوتی تھی۔

پھر بھی وقت بدل رہا تھا۔ 1896 اور 1898 میں سوامی وویکانند اور سوامی ستیادیو کماؤں کے علاقہ میں گئے اور وہاں انھوں نے لوگوں کے سامنے تقریریں کیں ان کی دھواں دھار تقریروں نے لوگوں کے دلوں میں قوم پرستی کی جوت جگائی۔ نوخیز گووند بھی

مجمعے میں موجود ہوا کرتے تھے اور جو کچھ انھوں نے سنا اس کا ان کے دل اور دماغ پر بڑا گہرا اثر بھی ہوا۔

ان کے نانا بدری ناتھ کا بھی ان پر بڑا گہرا اثر تھا۔ وہ بڑی اچھی اور مضبوط شخصیت کے مالک تھے۔ دل کھول کر لوگوں کی مدد کرنا اور انسان دوستی ان کی خصوصیات میں سے تھیں اور وہ ہر شام اپنے گھر کے بڑے کمرے میں ایک دربار لگاتے تھے۔ اس میں ہر طرح کی بات چیت ہوتی تھی، موسیقی اور ادب سے لے کر اس دور کی سیاست جس کا پورے ملک میں بڑا گرم چرچا تھا، سبھی پر خوب بحثیں ہوتی تھیں۔ گووند بھی پوری توجہ سے انھیں سنتے اور اپنے دماغ میں انھیں جماتے رہتے۔ وہ الموڑہ سے نکلنے والے الموڑہ اخبار اور دوسرے قوم پرست اخبار جیسے "شنگ واسی" اور "بھارت متر" بھی پڑھتے تھے۔ انھوں نے ایک خفیہ انجمن بھی "پپی کلب" کے نام سے بنائی تھی جس میں سیاست پر بات چیت ہوتی تھی۔ 1903 میں میٹرک کے امتحان میں گووند کا نتیجہ بہت شاندار تھا ان کی فرسٹ ڈویژن آئی تھی۔ انٹرمیڈیٹ (بارھویں کلاس) کی پڑھائی کے زمانے میں 1954 میں ایک دن جب بہت سخت سردی پڑ رہی تھی وہ بہت دور ٹہلنے کے بعد جب واپس لوٹے تو بہت سخت بیمار ہوگئے اس وقت ان کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ انھیں دل کا مرض بتایا گیا اور مراد آباد کے ایک آیورویدک علاج کے ماہر حکیم کو یراج درگادت نے ان کا علاج شروع کیا۔ اس بیماری کی وجہ سے وہ بہت دن تک لگ بھگ بیکار ہی رہے لیکن اس کے باوجود پورے صوبے میں انٹرمیڈیٹ میں ان کا نمبر بیسواں آیا جس کی وجہ سے انھیں بیس روپیہ مہینہ کا وظیفہ ملنا شروع ہوگیا۔

افق پھیلے

ہر بالا (برسات کی آمد) کا تہوار تھا۔ ساری پہاڑیاں ہرا جوڑا پہنے کھڑی تھیں۔ عورتیں لال

چھینٹ کے گھونگٹوں (پچورا) میں ہر طرف نظر آرہی تھیں۔ ان کے تنواری تلک ناک کے حصے سے مانگ تک کھنچے ہوئے تھے اور مردوں نے تازی ہری گھاس کے گچھے اپنی ٹوپیوں میں اڑس رکھے تھے۔

1905 کا سال تھا جب گووند بلبھ پنت اپنے گھر والوں سے رخصت ہوئے۔ اب وہ اپنی تعلیم کے سلسلے میں الہ آباد جارہے تھے۔ ان کے پیارے نانا پہلے ہی انتقال کر چکے تھے اور ان کے دوسرے عزیزان کے منصوبوں کے مخالف تھے "گووند کی صحت اچھی نہیں ہے" ان کا کہنا تھا۔ "میدانی علاقے کی گرمی یہ کیسے جھیل پائے گا۔" مگر گووند بھی اپنے ضد پر اڑے رہے۔ آگے پڑھنے کا ان کا ارادہ اٹل تھا چاہے انھیں اس کے لئے اپنی صحت سے ہی قیمت کیوں نہ چکانی پڑے۔

یہاں سے کاٹھ گودام تک ایک دودن کا گھوڑے کا راستہ تھا۔ اس وقت نہ کاریں تھیں نہ بسیں بلکہ موٹر چلانے کے قابل سڑکیں بھی نہیں تھیں۔ گووند کے ساتھ ان کا برہمن رسوئیا بھی جارہا تھا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جو شخص اپنی عمر کے اگلے حصہ میں چھوا چھوت کے خلاف اتنا جم کر لڑا ہو وہ اپنی عمر کے اس حصے میں ذات پات کے بندھنوں سے اتنی سختی سے جکڑا ہوا تھا۔

الہ آباد نے ان کی نگاہوں کے سامنے ایک پرجوش چلتی پھرتی دنیا پیش کردی۔ قدیم شہر پریاگ (جو اکبر کے زمانے میں صوبے کا پایۂ تخت ہو کر الہ آباد کے نام سے جانا جانے لگا) وہ صرف یاترا کا ایک مقدس مقام ہی نہیں تھا بلکہ سیاسی اور سماجی کاموں کا زبردست مرکز بھی تھا۔ اس وقت کے مشہور لکھنے والے اور ادیب شاعر اپنے دور کے جانے مانے سیاسی رہنماؤں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی شمالی ہندوستان کے بڑے تعلیمی اداروں میں گنی جاتی تھی۔

گووند نے میور سنٹرل کالج میں داخلہ لیا اور میکڈانل ہندو بورڈنگ ہاؤس میں رہنے لگے۔

ان کے کالج کے مضمون تھے ریاضی، سیاسیات اور ادب (لٹریچر)۔ طالب علم کی حیثیت سے ان کے استادوں پر ان کی ذہانت کا بڑا گہرا اثر تھا۔ ساتھ ہی وہ اپنے ہوسٹل کے ساتھیوں میں بھی بڑے ہردل عزیز تھے۔ ہرگووند پنت جنھوں نے کماؤں علاقے کی آزادی کی جدوجہد میں کافی آگے بڑھ کر حصہ لیا گووند کے سب سے عزیز دوستوں میں تھے۔

سیاست کی پکار

مانسون کی اُمس نے گووند بلبھ پنت کی صحت پر خراب اثر ڈالنے کے بجائے کچھ بہتری پیدا کی۔ وہ بہت زیادہ پڑھتے تھے۔ بنکم چندر کی آنند مٹھ جان اسٹوارٹ مل کی "آن لبرٹی (آزادی پر) اور میزنی اور ہربرٹ اسپینسر کی تحریروں کا اثر ان پر خاص طور پر گہرا تھا۔ انھوں نے چارلس ڈکنس، والٹر سکاٹ اور ولیم تھیکرے جیسے ادیبوں کا کلاسیکی ادب بھی پڑھا۔

1905 میں بنگال کی تقسیم کا اعلان ہوا اور سودیشی تحریک کی ابتدا ہوئی جس میں ہر ویسی چیز کا بائیکاٹ کرنا اور ہر دیسی چیز کو اپنایا جانا تھا۔ ظاہر ہے زمانے کی نبض کی دھڑکن سے گووند بھی دور نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ ہرگووند پنت کے سات 1905 میں کانگریس کے بنارس کے اجلاس میں سویم سیوک یعنی رضاکار کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اس اجلاس کی صدارت گوپال کرشن گھوکھلے نے کی تھی اور گووند پر ان کی تقریروں نے بالکل جادو سا کر دیا۔ مدن موہن مالویہ کا بھی ان پر بہت گہرا اثر تھا۔ 1907 کے کمبھ میلے میں بھی دونوں پنت (گووند اور ہرگووند) ساتھ ساتھ والنٹیر رہے۔ گووند نے بڑی زوردار تقریر بھی کی۔ اس کی رپورٹ ان کے کالج کے پرنسپل جینکنس کو بھی پہنچائی گئی۔ انگریز پرنسپل اپنے طالب علموں کے سیاسی کاموں میں حصہ لینے کا مخالف تھا۔ چنانچہ اس نے انھیں بی۔ اے کے امتحان میں بیٹھنے کی ممانعت کر دی۔ ظاہر ہے کہ گووند جیسے سنجیدہ اور اچھے طالب علم

کے لئے یہ زبردست پریشانی کی بات تھی۔ اس قضیے میں مدن موہن مالویہ بھی داخل ہوگئے اور انھوں نے قانونی طور پر اسے حل کرنے کی دھمکی دی۔ گووند کے ایک استاد مسٹر کوکس جو ان سے بہت محبت کرتے تھے انھوں نے بھی دخل دیا اور آخر جینگس کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔ مگر اس پورے جھگڑے میں گووند کا بڑا قیمتی وقت ضائع ہوا اور اس کے نتیجے میں بی۔ اے میں وہ صرف سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہو پائے۔

1907 میں بی۔ اے کے بعد انھوں نے کے۔ این کالجو اور اچاریہ نریندر دیو کے ساتھ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ فیصلہ ان کا بڑا سمجھ داری کا قدم تھا۔ انھیں قدرت نے بال کی کھال نکالنے والا دماغ دیا تھا جو قانون کی تعلیم کے لئے خاص طور پر موزوں ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے قانون کی تعلیم بڑی کامیابی سے حاصل کی اور قانون کے کالج کے پرنسپل سوراب جی انھیں اپنے کالج کا بڑا ممتاز طالب علم مانتے تھے۔

اپنی طالب علمی کے زمانے میں گووند جو ڈائری لکھا کرتے تھے اس سے ان کی شخصیت کے متعلق بہت سی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا دن بھر کا پروگرام کچھ اس طرح سے ہوتا تھا۔ صبح کو سات بجے اٹھتے۔ ترویینی (سنگم) ٹہلنے جاتے یا کبھی کبھی چوک (بازار) ہو آتے۔ الہ آباد آکر انھوں نے تیرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ ترویینی سنگم جہاں گنگا جمنا اور سرسوتی (جو ایک نظر نہ آنے والی خیالی دھارا ہے) ملتے ہیں ان کی پسندیدہ جگہ تھی۔

ان دو دریاؤں کے الگ الگ رنگوں کا ملتا ہوا پانی اور اس کے پیچھے اکبر کا بہت بڑا قلعہ یہ خوبصورت منظر انھیں کافی کافی دیر وہیں رکے رہنے پر مجبور کر دیتا۔ وہاں سے یہ موسیقی سیکھنے جاتے۔ ٹیوشن پڑھتے یا پڑھاتے اور پھر کھانا کھا کر کالج چلے جاتے۔

ان کی ڈائری سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس دور میں بھی ملک کی غلامی سے بڑے بے چین رہتے تھے اور پھر ملک میں عورتوں کی غیر انسانی حد تک گری ہوئی حالت بھی ان کے دماغ میں سخت الجھن پیدا کئے رہتی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے اسی دور میں کچھ فیصلے بھی کرلئے تھے۔ جیسے سگریٹ چھوڑنا۔ کچھ کتابیں خاص طور پر پڑھنا۔ موسیقی کا زیادہ ریاض کرنا۔ مگر اس فیصلے پر عمل کرنے میں انھیں کچھ دشواری ضرور محسوس ہوتی۔ ان کے سینے کا درد اب بھی انھیں پریشان کرتا رہتا تھا۔ پھر بھی یہاں ان کی صحت کل ملا کر بہتر ہی تھی۔

اس زمانے میں بچپن کی شادی بڑی عام بات تھی۔ چنانچہ گووند کی شادی گنگا دیوی سے 1899 میں بارہ سال کی عمر میں کردی گئی۔ فروری 1905 میں ان کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ باپ بننے کا اثر ان پر کافی گہرا تھا، مگر افسوس کہ ان کے بیٹے اور بیوی دونوں کا اگلے سال انتقال ہوگیا۔

1909 میں قانون کے امتحان میں ان کی پہلی پوزیشن آئی اور انھیں لومسڈن سونے کا تمغہ ملا جو موتی لال نہرو کو بھی مل چکا تھا۔ گووند نے جب الہ آباد چھوڑا تو وہ ایک پختہ انسان بن چکے تھے۔ اب صرف ان کی تعلیم ہی پوری نہیں ہوئی تھی بلکہ اصول اور ضابطوں کے جو تصورات ان کے ذہن میں ابھرے تھے وہ بھی پختہ ہوکر اب ان کے کردار کا حصہ بن چکے تھے۔

وکالت

گووند ولبھ پنت نے اپنی وکالت الموڑہ میں 1910 میں شروع کی اور انھیں بہت جلد کامیابی نصیب ہوئی۔ لیکن ایک دن ایک انگریز مجسٹریٹ نے ان کی کچھ بے عزتی کردی اور اس کے ساتھ ہی پنت نے اس کی عدالت میں کبھی نہ جانے کا عہد کرلیا۔ اس کے بعد کچھ دن انھوں نے رانی کھیت میں وکالت کی پھر 1912 میں کاشی پور چلے گئے جو ترائی کے علاقے میں بہت اچھا کھاتا پیتا تجارتی قصبہ تھا۔ ان کے والد کا تقرر بھی یہاں تھا۔ اسی سال انھوں نے دوسری شادی کی اور اپنی بیوی کو لے کر یہیں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہنا شروع

کر دیا۔

کاشی پور میں بھی ان کی وکالت شروع سے ہی چمک اٹھی اور جیسے جیسے ان کی مقبولیت بڑھی ان کے پاس مقدموں کا ایک تانتا سا بندھ گیا۔ اصل میں ریاضی (حساب) کی تعلیم نے ان کے دماغ کی کچھ ایسی تربیت کردی تھی کہ وہ معاملات کی بڑے ڈھنگ سے چھان بین کر سکتے تھے۔ اس صلاحیت نے وکالت میں ان کی بہت مدد کی۔ لیکن پنت نے اپنے لئے کچھ قاعدے اور اصول بھی مقرر کرلیئے تھے۔ وہ اپنے مقدموں کے بارے میں بڑے سکون اور بڑی احتیاط سے پڑھتے اور غور کرتے اور ایسا کوئی مقدمہ قبول نہ کرتے جس میں انھیں یقین ہوتا کہ ان کا موکل جس کا وہ مقدمہ لڑ رہے ہیں غلطی پر ہے۔ لیکن وہ غریبوں کے لیے بڑے ہمدرد تھے اور ان کے مقدمے وہ مفت بھی قبول کرلیتے تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی سماجی اور ادبی دلچسپیاں بھی جاری رکھیں۔ سماجی اور ادبی کاموں کے لئے انھوں نے 1914 میں پریم سبھا نام کی ایک تنظیم قائم کی۔ ایک مرتبہ انگریز حکومت نے پریم سبھا کے قائم کیے ہوئے اسکول کو کسی نہ کسی بہانے سے بڑے جرمانے لگا کر بند کرنے کی کوشش بھی کی پنت نے اس مسئلہ کو بھی پوری سنجیدگی سے سنبھالا۔ انھوں نے پیسہ جمع کرنے کا ایک بہت بہتر منصوبہ چلایا اور آخر کار اسکول کو بچا ہی لیا۔

گرمیوں میں تمام عدالتیں اوپر نینی تال چلی جاتی تھیں اس لئے پنت بھی چھ مہینے وہاں وکالت کرتے تھے اور پھر آہستہ آہستہ نینی تال میں ان کا قیام بڑھتا گیا۔ اب ان کی وکالت سے بہت اچھی آمدنی بھی ہورہی تھی۔

مگر جلدی ہی ان کی ذاتی زندگی میں تکلیف دہ حادثوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا 1914 میں انکے والد کا انتقال ہوا پھر جلدی ہی جب ان کے دوسرا لڑکا پیدا ہوا تو ان کی بیوی کا بھی انتقال ہوگیا۔ اسی سال ان کی بہن بھی بیوہ ہوگئیں۔ ظاہر ہے یہ ان کے لئے

بہت سخت جھٹکے تھے۔ ان صدموں سے ان کی طبیعت میں ایک اداسی سی پیدا ہوئی تھی جس سے چھٹکارا پانے کے لیے پنت کو پوری قوت سے اپنے اوپر قابو حاصل کرنا پڑا۔ انھوں نے خود کو اپنے کاموں میں بالکل غرق کر دیا۔ اپنے گھر بھی وہ صرف کھانا کھانے اور سونے چلے جاتے تھے۔ اس طرح بڑی مشکل سے انھوں نے اپنی زندگی کے اس المناک درد کو جھیلا۔

پنت تیسری شادی کا ارادہ نہیں رکھتے تھے لیکن اپنی ماں کی خوشی کے لئے انھوں نے 1917 میں کلادیوی سے تیس سال کی عمر میں شادی کی۔ اس شادی کے بعد ان کے یہاں ایک لڑکا کے۔ سی۔ پنت اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

1916 میں اینی بیسنٹ اور لالہ بھگوان داس کماؤں آئے اور الموڑہ میں ہوم رول لیگ کی شاخ قائم کی۔ اس کے بعد سے الموڑہ کے لوگ بھی جنگ آزادی میں بڑی لگن سے شامل ہوگئے پنت نے محسوس کیا کہ کماؤں کے لوگوں کو بھی سیاسی اور سماجی ناانصافی کے خلاف مل کر کھڑا ہوجانا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے 1916 میں کماؤں پریشد قائم کی۔ ان کے سامنے کتنے میدان تھے جدوجہد کے لئے ... قلی بیگار، ناخواندگی، بے پڑھا لکھا پن، بھوک، کسانوں کے پاس زمین نہ ہونا، جنگل کا مسئلہ وغیرہ۔ قلی بیگار جو انگریزوں کی شروع کی ہوئی زیادتی تھی، اس میں غریب لوگوں سے مفت محنت مزدوری لینے کا بدترین طریقہ تھا۔ انگریز افسر جب اس علاقہ میں دورے پر آتے تو وہاں کے لوگوں کو ان کا سامان ڈھونا ہوتا تھا اور انھیں اس کی کوئی مزدوری نہیں دی جاتی تھی۔ پنت نے قلی بیگار کی زیادتی کے خلاف کئی مظاہرے منظم کئے۔ ان میں سے ایک مظاہرہ 15 / جنوری 1921 کو مکر سکرانتی کے موقع پر مشہور باگیشور میلے کے موقع پر کیا گیا تھا۔ آخر ان مظاہروں کے دباؤ میں حکومت کو بیگار لینے کے اس طریقہ کو بند کرنا پڑا۔ 1916 میں پنت نے لکھنؤ میں کانگریس کے اجلاس میں پہلی بار شرکت کی اور یہیں وہ پہلی بار گاندھی جی سے بھی ملے۔ یہ اجلاس مشہور وکیل امبیکا چرن

مزدار کی صدارت میں ہوا تھا۔

پنت نے 1919 میں کماؤں کی ریاست کو مانٹیگو۔ چیمسفورڈ اصلاحات کے دائرے میں شامل کیے جانے کے لئے جدوجہد کی۔ ان اصلاحات کے تحت جنھیں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کا نام دیا گیا تھا، مرکزی قانون ساز کاؤنسل کو دو ایوانوں میں تقسیم کردیا گیا۔ امپیریل اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ (ریاستوں کی کونسل)۔ صوبائی قانون ساز اسمبلیوں کو بڑا کیا گیا تھا۔ اس میں چنے ہوئے ممبروں کی تعداد اب اکثریت میں تھی، لیکن مرکز کی ایگزیکٹیو کاؤنسل ان قانون ساز اسمبلیوں پر پکڑ رکھتی تھی۔ اسی طرح صوبوں میں گورنر کا راج ہوتا تھا۔ بہر طور، پنت کی کوششوں سے کماؤں کے علاقے کو یہ حق مل گیا کہ وہ بھی صوبائی اسمبلی میں اپنے یہاں سے چنے ہوئے نمائندے بھیج سکے۔

انگریزوں نے زبردستی الموڑہ اخبار کو بند کردیا جو سب سے پرانے قوم پرست اخباروں میں گنا جاتا تھا۔ مگر پنت نے 1918 میں شکتی، نام کا اخبار جاری کیا جو آج تک نکل رہا ہے۔

صوبائی اسمبلیوں کے لئے مونٹ فورڈ اصلاحات، کے تحت پہلے چناؤ 1920 میں ہوئے۔ کانگریس نے ان کا بائیکاٹ کیا۔ پنت نینی تال سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے مگر الیکشن ہار گئے۔

1921 کا احمد آباد کا کانگریس اجلاس جس کی صدارت حکیم اجمل خاں نے کی تھی، پنڈت پنت کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا (چونکہ یہ برہمن ذات سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ان کے نام کے ساتھ پنڈت کا لفظ بھی لکھا جانے لگا) اس اجلاس میں مہاتما گاندھی نے سول نافرمانی، اور عدم تشدد (کسی قسم کے لڑائی جھگڑے یا جارحیت بغیر) حکومت کے خلاف احتجاج کرنے کا نعرہ دیا۔ اس موقع پر پنت نے بھی اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کیا۔ انہوں نے اپنی بڑھی پھولتی پھلتی وکالت کو چھوڑ کر مہاتما گاندھی کے خیالات۔ کتائی بنائی، عدم تشدد، فرقہ واری ایکتا اور چھوت اچھوت کی برائی کو ہٹانے کی تبلیغ کا کام اپنے لئے چن

لیا۔ انھوں نے ان کاموں میں خود کو تن من دھن سے لگادیا حالانکہ اس کا صاف مطلب اپنی آمدنی کی بہت بڑی قربانی دینا تھا۔ پنت کاشی پور میں مفت لازمی تعلیم کے لئے بھی لڑے اور اس طرح یہی پہلے شخص تھے جنھوں نے ملک میں عوام کے لئے مفت تعلیم کا تصور پیش کیا۔

مقنّن (لیجسلیٹر)

اس زمانے میں کانگریس میں ایک اختلاف یہ کھڑا ہوا کہ اگلے چناؤ میں کانگریس کو کھڑا ہونا چاہئے یا نہیں۔ پہلی جنوری 1923 کو ایک سوراج پارٹی قائم کرکے سمجھوتہ کیا گیا۔ سوراج پارٹی کانگریس کے لوگوں کی ہی تنظیم تھی۔ 1923 میں ان کے نمائندے کی حیثیت سے پنت جی نینی تال سے کھڑے ہوئے اور چن لئے گئے۔

کماؤں کے نمائندے کی حیثیت سے یوپی کی قانون ساز اسمبلی میں داخل ہوتے وقت سیاسی طور پر ان سے کوئی واقف نہیں تھا۔

یوپی اسمبلی میں ان کی پہلی ہی تقریر نے بڑا زبردست اثر قائم کردیا۔ یہ پہاڑیوں کی کاٹ چھانٹ کے سلسلے میں ایک بل پر بولے تھے۔ موتی لال نہرو پر ان کی تقریر کا بہت اثر ہوا اور انھوں نے تجویز رکھی کہ انھیں اسمبلی میں پارٹی کا لیڈر ہونا چاہئے۔ سوراج پارٹی کے تیس ممبر تھے اور پنت ان کے بڑے مضبوط ترجمان یا لیڈر بن کر ابھرے۔ ممبری کے اپنے پورے دور میں یہ سماجی اور سیاسی اصلاحات پر زور دیتے رہے۔

ہماری آزادی کی تحریک کا یہ حصہ یوں بھی بہت اہم تھا۔ غیر ملکی حکومت کے خلاف جنگ کے ساتھ ہماری سماجی برائیوں کے خلاف بھی ایک مورچہ برابر چلتا رہا تھا، کیونکہ ان برائیوں کی وجہ سے ملک بہت پچھڑا ہوا تھا۔

کماؤں میں جنگل کے مسئلہ پر بھی پنت جی کھل کر پوری ہمت سے بولے۔ انھوں نے

زور دیا کہ گاؤں والوں کو جنگل کی پیداوار، سوکھی لکڑی اور گھاس، استعمال کرنے کی اجازت ملنی چاہیے۔

انھوں نے لڑکیوں کو بیچنے کے خلاف بھی جم کر آواز اٹھائی اور اس طریقے پر پابندی لگائی جانے کی مانگ کی۔ ہندوستان کے کچھ پچھڑے ہوئے حصوں میں یہ رواج تھا۔ ان کا خیال تھا کہ گھریلو صنعتوں اور چھوٹے دھندوں کو بڑھاوا دیا جائے اور شراب کو بند کردیا جائے۔

عدل وانصاف کو بااثر اور کارآمد بنانے کے لئے ان کے خیال میں یہ بات بھی ضروری تھی کہ عدلیہ (عدالتوں) کو انتظامیہ (سرکاری دفتروں) سے الگ کردیا جائے۔

اس زمانے میں برطانوی حکومت کی پوری حمایت کے ساتھ زمینداری نظام بھی خوب پھل پھول رہا تھا۔ کسانوں کی حالت بہت خراب ہوچکی تھی اور زمینداران بیچاروں کا بری طرح خون چوس رہے تھے۔ انھوں نے لگان میں کسی طرح کی بڑھوتری اور صوبائی کونسل میں زمینداروں کے نمائندوں کی تعداد بڑھانے کی سخت مخالفت کی۔ ان کی طرف سے زمینداری اور جاگیرداری نظام کے خلاف جنگ کا یہ پہلا اعلان تھا جس کے نتیجہ میں آزادی کے بعد بہت جلدی زمینداری نظام کو ختم کردیا گیا۔

پنت جی بڑی بے چینی سے یہ چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں کو اپنے ملک کی حکومت میں زیادہ حصہ ملنا چاہیے۔ سرکاری ملازمتوں میں ہندوستانیت پیدا کرنے (انڈینائزیشن آف سروس) کے موضوع پر بولتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ "ان ملازمتوں میں ہندوستانیوں کو زیادہ سے زیادہ داخل کرنا چاہیے تاکہ ان خدمات میں اصلی روح یا صحیح انداز (ہندوستانیت) پیدا ہو۔ ہماری خواہش ہے اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے اپنی حکومت کے مقصد کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔

وہ واقعہ جو کاکوری سازش کیس کے نام سے مشہور ہے 1925 میں ہوا تھا۔ جنگ

آزادی کے کچھ سپاہیوں نے ایک ریل گاڑی کو لکھنؤ سے کچھ دور کاکوری کے اسٹیشن پر روکا اور اس میں رکھے سرکاری خزانے کو لوٹ لیا۔ سرکار نے اس کا جواب جنگ آزادی کے بہت سے سپاہیوں کو گرفتار کر کے دیا۔ گووند بلبھ پنت نے ان کی طرف سے مقدمہ لڑا۔ انھوں نے رات دن ایک کر دیا اور وکالت کی جتنی بھی صلاحیت ان میں تھی سب اس مقدمہ کی پیروی پر لگا دی۔ لیکن حکومت طے کر چکی تھی کہ ان ملزموں کو سزا دی جائے۔ اس لئے پنت کی ہر ممکن کوشش کے باوجود، ان میں سے تین ملزموں کو موت کی سزا ہوئی اور باقی کو عمر قید کی۔

اگلے سال کانگریس میں اختلافات اور تقسیم کے باوجود پنت جی یوپی قانون ساز اسمبلی کے لئے پھر چنے گئے۔ لالہ لاجپت رائے اور مدن موہن مالویہ نے 1926 میں ایک الگ پارٹی نیشنلسٹ پاٹی نام سے بنالی تھی جو سوراج پارٹی والوں کی مخالف تھی۔ لیکن سی۔ وائی چنتامنی، جو نیشلسٹ پارٹی کے لیڈر تھے، وہ پنت جی کے دوست تھے۔ ان کی وجہ سے دونوں پارٹیوں نے کاؤنسل میں اپنا متحدہ ممبر بھیجا۔ اس طرح قانون ساز اسمبلی میں عام لوگوں کے معاملات کو نقصان نہیں پہونچا اور حکومت کے لئے پنت جی کے روپ میں ایک متحدہ اور مضبوط مخالف اسمبلی میں پہنچ گیا۔

سائمن کمیشن اور اس کے بعد

"کوئی دوسری قوم کسی ایک قوم کے لئے یہ کیسے فیصلہ کر سکتی ہے کہ وہ آزادی حاصل کرنے کے قابل ہے یا نہیں۔" پنت جی نے کہا۔ یہ وقت تھا 1928 کا حکومت برطانیہ نے ایک کمیشن مقرر کیا جس میں سب گورے لوگ تھے اور اس کا نام تھا سائمن کمیشن۔ مونٹ فورڈ رپورٹ، کے ذریعے حکومت کا جو نظام قائم کیا جانا تھا اس کے کام کے طریقوں کی چھان بین کر کے حکومت کو اطلاع دینا اس کمیشن کو سونپا گیا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ

ہندوستانیوں کو ملک کو چلانے میں شامل تو کیا جائے مگر آہستہ آہستہ۔ اس پالیسی اور حکومت کی اس زیادتی نے کہ اس کمیشن میں ایک بھی ہندوستانی نہیں رکھا گیا تھا پورے ملک میں زبردست ہلچل پیدا کردی۔

کانگریس نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس تحریک میں پنت جی نے بھی بھرپور حصہ لیا۔

یوپی کانگریس کمیٹی کے صدر کی حیثیت میں انہوں نے پورے صوبے کا دورہ کیا اور سائمن کمیشن میں ہندوستانیوں کے لئے جو بھید بھاؤ دکھایا گیا تھا اس کے خلاف بڑی دھواں دھار تقریریں کیں۔ انہوں نے یوپی کاؤنسل میں بھی بڑی سختی سے اس کی تردید اور مخالفت کی۔ اس سلسلے میں بڑی زبردست بحث ہوئی اور آخر کونسل نے سائمن کمیشن کے خلاف ایک قرارداد پاس کردی۔ حالانکہ حکومت اس پر زور دے رہی تھی کہ کونسل ایک ایسی کمیٹی بنائے جو اس کمیشن کو اس کے کام میں مدد کرے۔

اس مخالفت کے باوجود 11/ اکتوبر 1928 کو سائمن کمیشن دوسری بار ہندوستان کے ساحل پر اترا۔ جب یہ لاہور پہونچا تو لالہ لاجپت رائے نے اس کے خلاف جلوس نکالا۔ اسی موقع پر پولس کی لاٹھیوں سے بری طرح پٹنے کے بعد وہ اپنے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے 17 / نومبر 1928 کو انتقال کرگئے۔ گووند بلبھ پنت نے کاؤنسل میں انھیں بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔ اس کمیشن کے خلاف احتجاج میں انھیں خود بھی بہت تکلیفیں جھیلنی پڑیں۔ 29 / نومبر کو لکھنؤ میں پنڈت نہرو اور پنڈت پنت جب اس جلوس کی رہنمائی کررہے تھے اس وقت گھوڑ سوار پولس نے ان دونوں پر لاٹھیوں کی بوچھار کردی۔ پنت جی کا چھ فٹ سے زیادہ لمبا جسم ظاہر ہے پہلا نشانہ بنا۔ ان چوٹوں نے باقی پوری زندگی انھیں بہت تکلیف پہونچائی اور جسمانی طور پر کچھ معذور سا رکھا۔

جنگ آزادی کی رفتار اور ہلچل تیز سے تیز تر ہوتی رہی۔ 1927 میں ڈاکٹر مختار احمد

انصاری کی صدارت میں کانگریس کے مدراس کے اجلاس نے قرار داد پاس کی کہ اب صرف آزادی ہی قبول کی جائے گی۔ اس سے کم ڈومینین درجہ، نہیں مانا جائے گا۔ اس موقع پر بھی پنت جی کی تقریروں نے بڑا گہرا اثر ڈالا۔ کچھ دن بعد مہاتما گاندھی نے کماؤں آنے کا فیصلہ کیا۔ بلدوانی، کھولا، نینی تال، الموڑہ اور باگیشور گئے۔ کسونی میں اپنے قیام میں انھوں نے "گیتا اناسکتی یوگ" کے عنوان سے بھگود گیتا پر ایک کتابچہ بھی لکھا۔

ایک عظیم رول

دسمبر 1929 میں جواہر لال نہرو کی صدارت میں لاہور کے کانگریس کے اجلاس میں 1930 کے پہلے دن مکمل آزادی حاصل کرنے کا عہد کیا گیا تھا۔ کانگریس نے چناؤ کا بائیکاٹ کرنے کا بھی فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ فوراً ہی پنت جی نے کاؤنسل سے استعفیٰ دے دیا۔

12 / مارچ 1930 کو نمک ستیہ گرہ شروع ہوئی جس میں مہاتما گاندھی نمک بنانے کے لئے ڈانڈی تک گئے تھے۔ اس موقع پر یوپی میں پنت جی نے اس تحریک کو چلایا۔ اس سلسلہ میں ایک عجیب صورت پیدا ہوئی۔ یوپی میں کوئی جگہ ایسی تلاش کرلینا بڑا مشکل تھا جہاں نمک بنایا جاسکتا بہر طور کسی نہ کسی طرح ایک جگہ ایسی ڈھونڈ نکالی گئی اور وہاں کچھ نمک بنایا گیا۔ 20 / مئی کو پنت جی کو گرفتار کرکے دہرہ دون جیل بھیج دیا گیا۔ اس وقت وہ اتنے بیمار تھے کہ انھیں اسٹریچر پر لے جایا گیا تھا۔

40 ۔ 1939 کی دہائی کسانوں کے لئے بڑی تکلیفوں کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں اناج کی قیمتیں بری طرح گریں مگر زمیندار کسی طرح لگان کم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ لگان ادا نہ کرنے کی مہم 1920 کے بعد سے شروع ہو ہی چکی تھی۔ 1931 میں گاندھی ارون معاہدے کی وجہ سے روک دی گئی تھی۔ پنت جی کے ذہن پر کسانوں کی پریشانیوں کا ہمیشہ اثر رہتا

تھا۔ چنانچہ اب انھوں نے ایک کمیٹی بنائی اور کسانوں کی تکلیفوں کو حکومت تک پہونچایا۔ لیکن حکومت اور زمیندار دونوں نے بڑی بے رحمی کا انداز اپنایا۔ حالت یہاں تک بگڑی کہ کسانوں کو جو سوکھا امداد دی گئی وہ بھی بالکل ناکافی تھی۔

حکومت نے یوپی میں صوبائی کانگریس اجلاس منعقد کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس موقع پر بھی 18 /فروری 1932 کو پنت جی کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور پھر یہ اگست میں چھوٹے۔

1934 میں کانگریس نے پارٹی کی حیثیت میں چناؤ لڑنے کا فیصلہ کیا اور پنت جی نے مرکزی اسمبلی میں سیٹ جیت لی۔ لیکن جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 کے تحت یوپی قانون ساز کاؤنسل میں یہ چنے گئے تو انھوں نے مرکزی اسمبلی سے استعفے دے دیا۔

کانگریس وزارت

1937 میں یوپی کی وزارت کے یہی سربراہ تھے۔ اب پنت جی نے خود کو پوری طرح عوام کی حالت سدھارنے کے کام میں لگادیا۔ اس زمانے میں صوبے میں فرقہ وارانہ اختلافات اور اسی طرح چھوت چھات کے مسئلے بہت بڑھ چکے تھے۔ پنت جی نے ان برائیوں کو ختم کرنے کے لئے سخت جدوجہد شروع کی۔ کچھ دوسرے اہم کام بھی تھے۔ جیسے شہری آزادی، تعلیم میں اصلاحات، اور بہتری، مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لئے کام۔ پھر کسانوں پر زمینداروں کی زیادتیوں اور دباؤ کا مسئلہ تو تھا ہی۔ 1938 میں جب گورنر نے سیاسی قیدیوں کو رہا کردینے سے انکار کردیا تو انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ آخر گورنر کو ہی ان کے دباؤ کے سامنے جھکنا پڑا اور پنت جی نے استعفیٰ واپس لے لیا۔

1939 میں جنگ عظیم چھڑ گئی۔ مخالفت اور احتجاج کے باوجود برطانیہ نے ہندوستان کو زبردستی جنگ میں کھینچ لیا۔ اس پر تمام کانگریس وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا۔ اسی سال پنت جی کو ایک اور اہم کام انجام دینے کے لئے بلالیا گیا۔ یہ تھا تری پوری کانگریس اجلاس

میں صلح صفائی یا ثالثی کرنے کا کام۔ اس موقع پر مہاتما گاندھی اور سبھاش چندر بوس کے درمیان ایک بڑا اہم اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ حالانکہ پنت جی سبھاش چندر بوس کی بہت عزت اور قدر کرتے تھے مگر اس موقع پر انھوں نے تمام کانگریسیوں سے مہاتما گاندھی کا ساتھ دینے کی اپیل کی۔

1940 میں ستیہ گرہ کرتے ہوئے پنت جی پھر گرفتار ہوئے اور الموڑہ جیل میں قید کردئے گئے۔ اس زمانہ میں ان کے بچوں کو ان سے ملنے کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ بچے جیل میں ان سے برابر ملتے رہتے تھے اور بیڈمنٹن کھیل کر وقت گذارنے میں ان کی مدد کرتے تھے۔ ستیہ گرہ تحریک کی کامیابی کے اثر سے انگریزی حکومت کے انداز میں کچھ نرمی آگئی تھی۔ مگر ابھی بل نہیں گیا تھا۔ اس کے بعد 1942 میں سٹیفورڈ کرپس کی سربراہی میں کرپس مشن ہندوستان آیا۔

یہ جشن ناکام ہوا۔ اب کانگریس کو مکمل آزادی سے کم کوئی چیز منظور نہیں تھی۔

ہندوستان چھوڑو تحریک

8 / اگست 1942 کو بمبئی میں تاریخی میٹنگ ہوئی جس میں "ہندوستان چھوڑو" کی قرارداد پاس کردی گئی۔ ملک کے تمام بڑے لیڈر۔ مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، آچاریہ کرپلانی، مولانا آزاد، اور آصف علی گرفتار ہوگئے۔ انہیں میں پنڈت پنت بھی شامل تھے انھیں احمد نگر کے قلعہ میں قید کیا گیا تھا۔

قید کی کافی لمبی مدت تھی اس لئے سب لوگ کسی نہ کسی طرح خود کو کاموں میں لگائے رکھتے تھے پڑھنے لکھنے، باغبانی کرنے اور بیڈمنٹن کھیلنے میں۔

اس زمانے میں پنت جی برابر اپنے بچوں سے خط وکتابت کرتے رہے۔ جنگ آزادی میں کام کرنے کا ایک لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان سپاہیوں کو اپنے خاندان کی طرف توجہ

دینے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ قید سے لکھے ہوئے پنت جی کے خطوں سے اپنے بچوں سے ایک باپ کی گہری محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ انہی خطوں سے ایک اور ایسی خصوصیت کا پتہ بھی چلتا ہے جو عام طور پر لوگوں میں نہیں نظر آتی۔ بچوں کی دنیا میں پہنچ جانا اور اس سے سکون اور خوشی حاصل کرنا۔

وہ نصیحتوں اور وعظوں کے بغیر مشورے دے سکتے تھے، اور اس انداز میں ہدایت بھی کر سکتے تھے کہ دوسرے کو اس ہدایت کا احساس بھی نہ ہو۔

کبھی کبھی گھر کے چھوٹے موٹے معاملات یا مشکلوں کے خیال سے بھی وہ پریشان ہونے لگتے تھے۔ جیسے نینی تال کی تیز بارشوں سے بچنے کے لئے بچوں کو نئی برساتیاں ملیں یا نہیں۔ پھر کبھی وہ بدلتے ہوئے موسم اور الگ الگ فرقوں میں اُن موسموں سے جڑے تہواروں کے چکر کا مزہ لیتے، کبھی انھیں وہ پھول یاد آتے جو ان کے باغ میں اس وقت تک کھل رہے ہوں گے۔ ان کے خطوں میں نینی تال میں پہلی برفباری، جھیل کی مچھلیوں اور ایسی ہی بہت سی چیزوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ انھیں اس کا ہر وقت خیال رہتا تھا کہ بچوں میں اپنے ملک کی تاریخ اور اپنی تہذیب پر فخر کا احساس برابر باقی رہے۔ کبھی وہ اپنے خطوں میں بڑے کھلنڈرے اور خوش مزاج نظر آتے ہیں اور کبھی بڑے سنجیدہ اور چھوٹی چھوٹی بات کا احساس کرنے والے۔ ان خطوں سے پنت جی کے کردار کی بڑی اچھی جھلک ملتی ہے۔ وہ خود کیسے انسان تھے اور انھیں انسانیت سے کتنی گہری دلچسپی اور محبت تھی۔ انھوں نے ہر طرح کی چیزیں خوب پڑھی تھیں اور ان کی یادداشت بھی غضب کی تھی۔

ان کی صحت روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی، یہاں تک کہ پنڈت نہرو نے 1945 میں ان کو جلدی رہا کر دیے جانے کے لئے حکومت کو لکھا۔ بہر حال مارچ 1945 میں انھیں رہا کر دیا گیا۔ پوری طرح صحت یاب ہونے کے لئے انھیں کافی لمبے عرصے آرام کی ضرورت تھی۔ اسی سال وائسرائے لارڈ ویول نے ان تمام لیڈروں کو ایک کانفرنس کے لیے شملہ بلایا

جو اس وقت تک قید سے رہا ہو چکے تھے۔ پنت جی بھی ان میں شامل تھے۔ جنگ عظیم آہستہ آہستہ ختم ہوتی جارہی تھی اور جنگ میں برطانیہ کے ساتھی "اتحادی" برطانیہ پر زور ڈال رہے تھے کہ وہ ہندوستان کے مسئلہ کو جلدی حل کرے۔ محمد علی جناح کی مانگ تھی کہ پاکستان کے مسئلہ کو پہلے طے کرلیا جائے۔ وہ دوسرے لیڈروں سے متفق نہیں تھے۔ اس سلسلہ میں بھی بات چیت کا کام پنت جی کو سونپا گیا۔ بہر حال بات چیت اور صلح صفائی کی اپنی تمام صلاحیتوں کے باوجود پنت جی جناح کو راضی نہ کرسکے۔ کانفرنس ناکام رہی۔

انگلستان میں لیبر پارٹی کی کامیابی (اور حکومت) کے ساتھ ہی حالات بدل گئے۔ 1946 میں کیبنیٹ مشن، ہندوستان آیا اور اس نے ایک قانون ساز اسمبلی، اور مرکز میں ایک عارضی حکومت کی سفارش کی۔ برطانیہ کے وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلے نے 30 جون 1948 تک اقتدار (حکومت) ہندوستانیوں کو سونپ دینے کا اعلان کردیا۔ لارڈ ویول نے استعفیٰ دے دیا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نئے وائسرائے مقرر ہوئے۔

ملک کا بٹوارا ایک بڑا اٹھا ہوا مسئلہ تھا۔ پنت جی اس کے بڑے سخت مخالف تھے، مگر اسے بھی وقت کی ستم ظریفی کہا جاسکتا ہے کہ 14 / جون 1947 کی آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں ملک کی تقسیم کو تسلیم کرلینے کی قرار داد پیش کرنے کے لیے بھی پنت جی کو ہی چنا گیا۔ جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل نے اس کی تائید کی۔

15 / اگست 1947 کو ہندوستان آزاد ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی پنت جی نے اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کا حلف لے لیا۔

قوم کی تعمیر

گووند بلبھ پنت کو نئے اتر پردیش کا جنم داتا یا باپ کہا جاسکتا ہے۔ 1946 میں جب کانگریس نے چناؤ میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو وہ اسمبلی کے لئے بریلی سے چنے گئے۔ پھر اسمبلی

میں کانگریس پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے وہ بلا مقابلہ چنے گئے ۔ یہ بڑا کٹھن وقت تھا۔ فرقے واری اختلافات، بے روزگاری اور کالا بازاری کا دور دورہ تھا۔ پنڈت پنت نے ان مسئلوں کا جم کر مقابلہ کیا۔ مقررہ قیمتوں کی راشن کی دوکانیں کھلیں اور کرپشن اور بے ایمانی کی روک تھام کے لئے ایک شعبہ قائم کیا گیا۔ قانون اور انتظام کے مسئلے کو بھی حل کیا گیا۔ یوپی کے پرانے نام "صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ" کو اتر پردیش میں بدل دینے کے بھی پنت جی ہی ذمے دار ہیں۔ جب ان کی وزارت شروع ہوئی تو لگتا تھا کہ مسئلے حل ہی نہیں ہو سکیں گے۔ ملک کے بٹوارے کے نتیجہ میں فرقے واری جھگڑے فساد ہولناک حد تک پھیل گئے تھے۔ پنت جی نے ان علاقوں کا برابر دورہ کیا۔ لوگوں سے اپیل کی اور آخر بگڑی ہوئی صورت حال پر قابو پا ہی لیا۔ ایک ایسی ریاست پر حکومت کا کام، جو اتر پردیش جیسی بہت بڑی آبادی والی بھی ہو اور بے حد پچھڑی ہوئی بھی ہو، ایک چنوتی سے کم نہیں تھا۔ یہ کام اس صورت حال میں اور بھی مشکل تھا کہ غیر ملکی نوآبادیاتی حکومت کے انداز سے اب قومی حکومت کی طرف تبدیلی آرہی تھی۔ پنت جی کی کوششوں کا سب سے بڑا مرکز عام لوگوں کی حالت کو سدھارنے کی طرف تھا۔ 1952 میں ان کا زمینداری ختم کر دینے کا خواب بھی پورا ہوا، چونکہ اس نظام نے ہی کسانوں کی حالت کو اس گراوٹ تک پہنچایا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے کسانوں کو مدد پہونچانے کے لئے اور بھی کئی اہم کام انجام دیے۔ بہت سی نہریں تیار ہوئیں اور کھیتی باڑی کے طریقوں میں بہتری کے کئی کام ہوئے۔ انھوں نے صنعتی کاموں کی طرف سے بھی بے توجہی نہیں برتی بلکہ گھریلو اور چھوٹے دھندوں کو ابھارنے میں مدد کی۔ تعلیم، عوام کی صحت، ہریجنوں کو بہتر مقام دلانے، اور پنچائتی نظام قائم کرنے، غرض تمام میدانوں میں کام آگے بڑھایا۔

پنت جی کو یوپی کا "پیشوا" کہا جاتا تھا۔ نو سال تک انھوں نے اس ریاست کے لوگوں کی قسمتوں کو بدلنے میں راستہ دکھایا۔ ان کے بعد ریاست میں اتنی تیز ترقی کبھی نہیں ہوئی۔

1950 میں سردار پٹیل کی موت کے بعد پنڈت نہرو نے پنت جی سے مرکز کے وزیر داخلہ بننے کی درخواست کی۔ یہ سچ مچ بڑا آزمائشی کام تھا، مگر پنت جی نے اپنے مثالی صبر و سکون اور زبردست انتظامی لیاقت اور صلاحیت کے ساتھ اس ذمے داری کو بھی قبول کیا۔ انھوں نے سردار پٹیل کے شروع کیے ہوئے عظیم کام۔ ملک کی سالمیت کا منصوبہ (تمام دیسی ریاستوں کو ہندوستان کا حصہ بنانا) پورا کیا۔

انھوں نے ایک اور ٹیڑھے مسئلے۔ ہندی کو ملک کی دفتری زبان بنانے۔ کی تجویز کو پیش کیا اور چونکہ یہ بڑی نپی تلی مگر بہت اچھی تقریر کرتے تھے، اس لئے انھوں نے مخالفوں کو اپنی بات مان لینے پر راضی کر ہی لیا۔ اس طرح اس وقت جو بھی مسئلے اور جو دشواریاں بھی ان کے سامنے آئیں انھوں نے انھیں حل کر لیا۔

1957 میں پنت جی کو دل کا دورہ پڑا۔ یوں بھی ان کی صحت کبھی بہت اچھی نہیں رہی تھی اور انھوں اپنی جسمانی پریشانیوں کی ان دیکھی بھی کافی کی تھی۔ ڈاکٹروں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ پہاڑوں پر نہ جائیں۔ 20 / فروری 1961 کو جب وہ اپنے سکریٹری جانکی بابو کو دفتری نوٹ لکھوا رہے تھے، وہ ایک دم بیمار ہوئے، پھر کئی دن تک بے ہوشی (کوما) میں رہے، اور آخر 7 / مارچ 1961 کو رخصت ہوگئے۔ اس قوم نے جس کی قسمتوں کو نئے سرے سے بنانے اور ان کی حالت کے بہتر کرنے کے لئے اتنا اہم کردار ادا کیا تھا، ان کی موت پر گہرا سوگ منایا۔

دور دراز کے پہاڑی علاقے کا ایک عام لڑکا بہت ترقی کر کے اس مقام تک پہونچا تھا۔ پنڈت پنت حقیقت میں ایک ایسے انسان تھے جو خالص اپنی لیاقت اور لگن سے اتنے اونچے درجے پر پہونچے تھے۔ ان میں صلاحیتیں بہت، اور بہت مختلف قسم کی تھیں۔ وہ ہمارے ملک کی پارلیمنٹ کے کچھ زبردست تقریر کرنے والوں میں سے تھے۔ بہت کم لوگ تھے جو تقریر کے فن اور پارلیمانی بحثوں میں ان کے ہم پلہ کہے جا سکیں۔ وہ کئی کئی گھنٹے لگاتار تقریر کر سکتے

تھے۔ بات چیت کے ذریعہ مسئلوں کے حل، مصالحت اور آپسی سمجھوتا کرانے میں بھی وہ پوری طرح کامیاب رہتے تھے۔ ہر مسئلے پر ان کا خیال یا سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ بڑا مضبوط اور اٹل ہوتا تھا اور وہ معاملات اور ان کے نتیجوں کو بہت دور تک دیکھ اور سمجھ سکتے تھے۔ اس سے پہلے کہ کسی مسئلہ کا حل کرنا ناممکن ہوجائے وہ ان کی نگاہ پر چڑھ جاتا اور وہ اس پر کام شروع کردیتے تھے۔ عام لوگوں کی رائے کی بھی وہ بہت قدر کرتے تھے، اور پریس یا اخبار جو کردار ادا کرتے ہیں اسے بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔

ان کے دل میں سماج کے کمزور اور کچلے ہوئے طبقوں کا بہت درد تھا اور جس چیز کو وہ صحیح سمجھتے تھے اس کے کرگزرنے میں انھیں کسی قسم کا خوف یا جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ وہ اپنے کھانے اور لباس کے معاملے میں بے فکری کی حد تک سادہ مزاج تھے مگر زندگی کا پورا لطف اٹھانے کی صلاحیت بھی ان میں موجود تھی۔ اپنی کمزور صحت کے باوجود وہ بڑے مضبوط اور بڑی لگن سے کام کرنے والے انسان تھے۔ وہ صرف ایک لائق منتظم ہی نہیں تھے بلکہ ملک کے مالی معاملات کو حل کرنے والے چند بہترین ذہنوں میں بھی گنے جاتے تھے۔

پوری زندگی وہ اپنے اسی مقصد کی طرف قدم بڑھاتے رہے جو انھوں نے اپنے لیے طے کیا تھا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ پنت جی نے گیتا میں دیئے ہوئے سبقوں کو اپنی زندگی میں پوری طرح سمونے کی کوشش کی تھی۔ پنت جی صحیح معنوں میں ایک مدبر سیاست داں، اور منتظم تھے چونکہ ان میں معاملات کو ہر پہلو سے دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت تھی، خدمت کا اٹھک جذبہ تھا، غریبوں اور پچھڑے لوگوں کے سدھار کے لئے بے چینی تھی اور کاموں کو منظم کرنے کی زبردست لیاقت تھی۔ بہر طور نئے ہندوستان کی تعمیر میں انھوں نے جو زبردست کردار ادا کیا اسے کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔

رام منوہر لوہیا

پرکاش ویریشور

"اے مادرِ وطن ۔۔۔ اے ہندوستان ۔۔۔ ہمیں دے دے

شیو کا دماغ

کرشن کا دِل

اور رام کا قول اور عمل

ایک بے حد و حساب ذہن،

اور بھر پور آزاد دل کے ساتھ

ہماری پرورش کر۔

لیکن زندگی ۔۔۔ وہ اصول کی پابند ضرور ہو۔"

رام منوہر لوہیا۔

رام منوہر لوہیا

یہ مادر وطن کے ایک نڈر سپوت کی کہانی ہے۔ اس شخص کی کہانی جو لاکھوں لوگوں کے دلوں کا بے تاج بادشاہ تھا۔ جو غریبوں کے لیے لڑنے والا اور کمزور اور پچھڑے لوگوں کا دوست، بلکہ عوام کا مسیحا کہا جاسکتا تھا۔۔۔ یہ شخص تھا رام منوہر لوہیا۔

10 اکتوبر 1967 کو نئی دلی میں ولنگڈن اسپتال کے لانس میں بے چین لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ہر چہرے پر ایک بے چینی تھی، اور خاموش دعائیں دلوں سے نکل رہی تھیں۔ لوگ سانس روکے ہوئے اپنے محبوب لیڈر کی صحت کے متعلق اعلان کا بے چینی سے انتظار کررہے تھے۔ اور اسپتال کے ایک کمرے میں موت اور زندگی کے بیچ ایک کشمکش جاری تھی۔ رام منوہر لوہیا۔ مشہور سوشلسٹ رہنما۔۔۔ موت سے جنگ لڑ رہے تھے۔ نہ اب ان کی کوئی سیاسی حیثیت تھی، نہ طاقت اور نہ کوئی بڑا عہدہ۔

لوہیا جی نے آنکھیں کھولیں۔ ادھر ادھر دیکھا اور اپنے کچھ دوستوں کو پہچانا۔ اور پھر ان کی نگاہ اپنے چاروں طرف کھڑے ڈاکٹروں پر پڑی جنھیں دیکھ کر ان کے چہرے پر کچھ الجھن سی نظر آئی۔ "اتنے بہت سے ڈاکٹر، صرف ایک آدمی کے لیے؟ جب کہ میرے دیس کے لاکھوں لوگوں کو ایک ڈاکٹر کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوتی۔"

ان کے لیے 11 کی رات بڑی کانٹے کی رات تھی۔ 12 کی صبح کو بہادر نے جدوجہد چھوڑ دی اور ہمیشہ کے لیے سکون سے لیٹ گیا۔

پوری قوم گہرے سوگ میں ڈوب گئی۔ طاقت اور حکومت سے باہر شاید ہی کسی دوسرے شخص کو وہ عزت اور احترام ملا ہو جو موت کے بعد انھیں عوام نے دیا۔ بعد میں اس اسپتال کو، جہاں ان کا انتقال ہوا تھا، "رام منوہر لوہیا اسپتال" کا نام دے دیا گیا۔

رام منوہر لوہیا وطن سے سچی محبت رکھنے والے رہنما، جنگ آزادی کے سپاہی، باغی اور ایک نڈر ہیرو، سب ہی کچھ تھے۔ انھوں نے صرف ہندوستان کی جنگ آزادی میں ہی حصہ نہیں لیا وہ گوا اور نیپال کی آزادی کی جدوجہد میں بھی شریک تھے۔ اصل میں وہ ہر اس زنجیر یا پابندی سے آزادی کے لیے لڑتے تھے جو انسانوں کو جکڑ لیتی ہے۔

وہ مارکسی (کارل مارکس کے اصولوں کو ماننے والے) ضرور تھے مگر ان میں کٹرپن نہیں تھا۔ وہ مہاتما گاندھی کے بھی دل وجان سے پیرو تھے مگر اندھی تقلید ان کی بھی نہیں کرتے تھے۔ وہ خود اپنی ایک آزاد فکر اور سوچ رکھتے تھے جو اپنے وقت سے آگے تھی، کسی کے پیچھے نہیں تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک فلسفی بھی تھے اور سیاسی لیڈر بھی۔

لیکن ان سب باتوں سے اوپر وہ ایک بے حد ہردل عزیز انسان تھے جن کے اپنے چہرے پر بچوں کی سی معصوم مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی اور ان کے دل میں بچوں کے لیے سچی محبت کروٹیں لیتی تھی۔ بچوں کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں ایک نئی چمک اور تازگی سی پیدا ہوجاتی تھی۔ "مجھے کیسے چین آسکتا ہے، اور اگر میرے ملک میں ایک بچہ بھی بھوکا ہے تو میں کس دل سے کھا سکتا ہوں؟" یہ جملہ بارہا ان کے منہ سے سنا گیا تھا۔

اور اس نرم طبیعت کے باوجود وہ ہیرے کی طرح تراشے ہوئے سخت باغی بھی تھے۔ وہ بھی مہاتما گاندھی کی طرح عدم تشدد (طاقت کے استعمال نہ کرنے) پر یقین رکھتے تھے۔ لیکن لوہیا کا عدم تشدد، بے حرکت یا بزدلی کی خاموشی نہیں تھا۔ یہ ایک حرکت والا ہتھیار تھا جس سے ظلم وزیادتی کا منہ توڑ جواب دیا جاسکتا تھا۔ یہ طاقت (شکتی) کا ایک روپ تھا۔ وہ طاقت جو کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی مگر برائی کو مٹا ڈالتی ہے۔

بچپن

رام منوہر لوہیا 23 مارچ 1910 کو یوپی، کے ضلع فیض آباد میں اپنے خاندانی گاؤں اکبرپور میں پیدا ہوئے تھے ۔ ان کے والد ہیرا لال اسکول کے استاد تھے اور ان کی والدہ کا نام چندا تھا۔ رام منوہر ان کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کی ماں کا انتقال اسی وقت ہوگیا تھا جب یہ صرف ڈھائی سال کے تھے۔ اس لئے ان کی پرورش ان کی دادی نے کی تھی، مگر یہ بھی رام منوہر کو دس سال کا چھوڑ کر سدھار گئیں۔

رام منوہر کے دادا پر دادا مشرقی یوپی کے بیوپاری طبقے (ویش) سے تعلق رکھتے تھے اور چونکہ یہ خاندان لوہے کا بیوپار کرتا تھا اس لئے "لوہیا" کہا جانے لگا تھا۔ جب رام منوہر کی ماں کا انتقال ہوگیا تو ان کے والد ہیرا لال نے بمبئی جاکر خود کو پوری طرح کانگریس کے کاموں میں لگادینے کا فیصلہ کرلیا، اور ظاہر ہے رام منوہر ان کے ساتھ تھے ۔ انھیں بمبئی میں مارواڑی ہائی اسکول میں داخل کردیا گیا۔ اور بس اسی اسکول سے ان کے سیاسی کاموں کی ابتدا ہوگئی۔ پہلی اگست 1920 کو لوکمانیہ تلک کی موت ان کے لیے ایک اہم سیاسی جھٹکا ثابت ہوئی۔ انھوں نے طالب علموں کو جمع کیا اور ان کی ہڑتال کی رہنمائی کی۔ اس زمانے میں اُن کے سیاسی کاموں میں دوسرے ملکوں سے منگائے کپڑوں کو جلانا، کھادی کا پرچار اور "سول نافرمانی" شامل رہے۔

ہیرا لال خود سودیشی، تحریک میں لگے ہوئے تھے ۔ ایک دن یہ اپنے نوعمر بیٹے کو گاندھی جی سے ملانے لے گئے ۔۔۔ اور بس انھیں دیکھتے ہی یہ لڑکا ان سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے جھک کر گاندھی جی کے پیر چھولیے ۔۔۔ حالانکہ یہ بات اس کی اپنی عادت کے خلاف تھی۔ اس طرح دس سال کی عمر میں ہی رام منوہر گاندھی جی کی ستیہ گرہ کے پروگرام میں شامل ہوگئے۔

1921 میں لوہیا کی ملاقات پہلی بار جواہر لال نہرو سے ہوئی۔ اور یہ پہلی ملاقات ہی

ایسی پھولی پھلی کہ آپسی محبت اور دوستی کے زندگی گھر کے رشتے میں بدل گئی۔ لوہیا بعد میں نہرو کی پالیسیوں پر شاید سب سے سخت نکتہ چینی اور مخالفت بھی کیا کرتے تھے لیکن ایک انسان کی حیثیت سے انھیں اتنا ہی پسند بھی کرتے تھے۔

جس زمانے میں لوہیا 1963 میں، چین سے جنگ کے بعد، پارلیمنٹ کے ممبر تھے، کسی نے نہرو پر نکتہ چینی کی تو لوہیا ان کی حمایت میں ایک دم کھڑے ہوگئے "مگر آپ تو لوہیا جی، خود نہرو جی پر تنقید کرتے رہتے ہیں،" ان صاحب نے یاد دلایا۔

"ہاں۔۔۔ میں کر سکتا ہوں۔۔ اس لیے کہ میں ان سے اتنی ہی محبت بھی کرتا ہوں۔ کیا آپ ان سے اس میری محبت کے ایک ذرّے برابر بھی محبت کرتے ہیں۔ پھر۔۔۔ آپ کی کیا مجال کہ آپ نہرو کے خلاف کوئی بات کریں،" لوہیا جی نے پلٹ کر جواب دیا تھا۔

1924 میں، صرف 14 سال کی عمر میں ہی لوہیا نے کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرلی تھی۔

اور پھر 1925 میں انھوں نے میٹریکولیشن کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور اپنے اسکول میں پہلی پوزیشن بھی حاصل کی۔

طالب علموں کے لیڈر

لوہیا کسی سرکاری ادارے میں داخلہ لینا نہیں چاہتے تھے اس لیے وہ انٹرمیڈیٹ (بارھویں جماعت) کرنے کی غرض سے بنارس ہندو یونیورسٹی چلے گئے۔ اور بس وہاں کے رہن سہن اور زندگی کے ماحول نے ان کی شخصیت کو ایک خاص رنگ میں ڈھال دیا۔ وہ بہت ذہین، پڑھے لکھے، بلکہ عالم اور شعلہ بیان مقرر بن گئے۔ یہیں ان کی وہ صلاحیتیں بھی ابھریں اور مانجھی گئیں جنھوں نے انھیں ایک لیڈر بنادیا۔ اس زمانے میں یہ پتلے دبلے، خاصے سانولے اور کچھ چھوٹے قد کے مگر بڑے ہردل عزیز نوجوان تھے۔ وہ صرف کھادی

کے کپڑے پہنتے تھے اور سنہری باریک سے فریم کا چشمہ لگاتے تھے۔ لوگ انھیں خوش مزاج، نیک طبیعت اور آرٹسٹ قسم کے نوجوانوں میں گنتے تھے۔

تاریخ ان کا من پسند مضمون تھی۔ اور اس سلسلے میں ان میں اتنی سمجھ بوجھ یا ذہانت اور اتنی جرات دونوں چیزیں موجود تھیں کہ وہ تاریخ میں پڑھائی جانے والی غلط باتوں کو چنوتی دے سکتے تھے۔ اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ جماعتوں کو پڑھائی جانے والی تاریخ کی ایک کتاب تھی جسے کسی انگریز نے لکھا تھا۔ اس میں شواجی کو ایک لٹیرا سردار لکھا گیا تھا۔ لوہیا نے اس بیان کو چنوتی دے دی۔ انھوں نے لائبریری کھنگال ڈالی، صحیح باتوں کو جمع کیا اور انھیں ڈھنگ سے پیش کیا۔ اور آخر ان کی اس جرات اور محنت کا یہ نتیجہ نکلا کہ یہ غلط اور دل دکھانے والے الفاظ کتاب سے نکال ڈالے گئے۔

1926 میں لوہیا گوہاٹی کانگریس میں شریک ہوئے۔ اس کی صدارت ایس، سری نواسا آئنگار نے کی تھی۔ ان کی ممتاز طبیعت اور دل کے جوش وخروش نے ہر شخص پر گہرا اثر چھوڑا۔

لوہیا نے بی۔ اے۔ کلکتہ یونیورسیٹی سے کیا۔ وہاں بھی وہ طالب علموں کے غیر بنگالی لیڈروں میں بڑے مقبول اور ممتاز رہے۔ انھیں بنگالی کلچر اور زندگی سے پوری زندگی جو محبت اور قربت رہی اس کے بیج بھی زندگی کے اسی حصے میں بوئے گئے تھے۔ اس زمانے میں انھیں بنگالی ڈرامے اور انگریزی فلمیں دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ بڑی دھواں دھار تقریریں کرتے تھے۔ اس زمانے میں انھیں گرما گرم چٹپٹا کھانا، چاٹ اور گول گپوں جیسی چیزوں کا بھی بڑا شوق تھا۔ حالانکہ بعد میں انھیں صحت کی خرابی کی وجہ سے ہلکی پھلکی اور کم چٹپٹی (مونگ کی دال) غذا پر زندگی گزارنی پڑی۔

1928 میں انھوں نے "سائمن واپس جاؤ" کے نعروں کے ساتھ سائمن کمیشن کے خلاف طالب علموں کا مظاہرہ کیا۔ 1929 میں انھوں نے بی۔ اے۔ کیا۔ وہ جواہر لال سے

دوبارہ ملے اور پھر سبھاش چندر بوس سے بھی ان کی ملاقات ہوئی۔ ان دونوں شخصیتوں کا ان کے ذہن اور دل پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ انھیں سبھاش چندر بوس اپنے خیالات کی صفائی اور بے باک ہمت وجرات کی وجہ سے بہت پسند تھے۔

برلن میں

بی۔ اے۔ کے بعد رام منوہر اعلا تعلیم کے لیے کسی باہری ملک کی یونیورسٹی جانا چاہتے تھے۔ مگر اس میں دو رکاوٹیں تھیں۔ پہلی پیسے کی۔ دوسرے ملکوں میں تعلیم کا خرچ بہت زیادہ تھا۔ لیکن اس مسئلے کو تو ان کے فرقے کی ایسوسی ایشن نے حل کردیا۔ یہ ایسوسی ایشن اپنے فرقے کے ہونہار اور ایسے نوجوانوں کو مالی امداد دیتی تھی جن سے آگے چل کر کچھ بن جانے یا کام کی امید ہوتی تھی۔ چنانچہ 1929 میں ان کے بہترین رکارڈ کی بنیاد پر مالی امداد دے دی گئی۔ اب کسی ملک میں کوئی اچھا ادارہ چننا ان کا کام تھا۔ انھوں نے برطانیہ کی کسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے سے صرف اس لئے انکار کردیا کہ انگریزوں نے ہندوستان کو اپنی ایک نوآبادی (کالونی) بنالیا تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنی تعلیم کے لیے برلن یونیورسٹی کو چنا۔ انھیں جرمن لوگ اپنے کھلے دماغ اور سائنسی ذہن یا علم دوستی کی وجہ سے پسند بھی تھے۔ لیکن یہاں بھی زبان کا ایک مسئلہ تھا۔ بہر حال، لوہیا نے جرمن سیکھ کر اس کو بھی حل کرلیا۔ انھوں نے پہلے جرمن زبان کو اچھی طرح سیکھا اور پھر برلن یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ لوہیا نے ایک بہت ذہین اور پایے کے عالم کو اپنا پروفیسر اور ریسرچ کا سپروائزر چن لیا اور کام شروع کردیا۔

اسی دوران جنیوا میں لیگ آف نیشنس کا اجلاس ہونے والا تھا۔ لوہیا نے اس تاریخی اجلاس کو خود جنیوا جاکر دیکھنے کا ارادہ کیا۔ حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی نمائندگی کرنے کے لیے اس اجلاس میں مہاراجا بیکانیر کو بھیجا تھا۔ لوہیا نے باہر سے سننے والوں کی

(وزیٹرس) گیلری سے ہی اس پر احتجاج کیا۔ "برطانیہ کا ایک ایجنٹ ہندوستان کا سچا نمائندہ نہیں ہوسکتا۔" انھوں نے کہا۔ انھوں نے بہت سے اخباروں کے اڈیٹروں کو خط لکھے اور پمفلٹ چھپواکر اجلاس کے مقام پر بٹوائے۔ برطانوی حکومت اس حرکت سے پریشان بھی ہوئی اور کافی جھنجلائی بھی، مگر کچھ کرنہ سکی۔ ہندوستان میں قوم پرست اخباروں میں اس احتجاج کی خوب اشاعت ہوئی اور خوب ہنگامہ رہا۔

اور بس اس کے ساتھ ہی ایک گرم انقلابی اور ایک ایسے نوجوان کے روپ میں لوہیا لوگوں کی نگاہوں میں آگئے جن سے آئندہ کچھ کرنے کی امید کی جاسکتی تھی۔ پھر انھوں نے جرمنی میں ہندوستانی طالب علموں کو منظم کیا۔ وہ "وسطی یورپ میں ہندوستانی طالب علموں کے ایسوسی ایشن" کے سکریٹری ہوگئے۔ اس تنظیم نے ہندوستان سے باہر خصوصا یوروپ میں ہندوستانی قوم پرستی کا پرچار کرنے میں بہت مدد دی۔

برلن میں لوہیا نے جو دن گزارے ان کا اثر ان کے کردار پر بڑا گہرا رہا۔ انھوں نے کارل مارکس کی تحریروں کو خود جرمن زبان میں پڑھا۔ اسی لیے وہ پوری زندگی پوری طرح مارکسی رہے۔ لیکن انھوں نے مارکس کے خیالات اور نظریوں کو ہندوستان کے رہن سہن اور یہاں کے حالات میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ مگر وہ کسی نظریے کو عقیدہ بنالینے یا اس کے لیے کٹرپن کے خلاف تھے۔ برلن میں تو کمیونسٹوں سے ان کی جھڑپیں بھی ہوجاتی تھیں۔ یہ برلن میں رہنے کا ہی اثر تھا کہ وہ پوری زندگی کمیونسٹوں کی مخالفت کرتے رہے۔

1932 میں لوہیا نے برلن یونیورسٹی میں اپنا تھیسس پیش کیا اور انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ (ڈاکٹریٹ) کی ڈگری مل گئی۔ ان کے تھیسس کا موضوع تھا "نمک ستیاگرہ"۔ انھوں نے اپنے تھیسس میں گاندھی جی کے سماجی، معاشی خیالات اور نظریات پر بحث کی تھی اور ان کا تجزیہ کیا تھا۔ انھوں نے یہ کام بڑی بھرپور ذہانت اور سمجھ بوجھ سے کیا تھا اسی لیے عالموں اور دانشوروں نے اسے بہت سراہا۔

لوہیا 1933 میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے کر واپس آگئے۔ جب وہ مدراس میں جہاز سے اترے ہیں تو ان کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ اپنے وطن تک واپس لوٹ سکیں۔ چنانچہ وہ سیدھے ایک مشہور قوم پرست اخبار "دی ہندو" کے دفتر پہنچے اور ان لوگوں سے پوچھا کہ کیا وہ ان کے ایک مضمون کا معاوضہ فوراً دے سکتے ہیں؟ اور جیسے ہی انھوں نے "ہاں" کہا، لوہیا ایک اکیلے کمرے میں بیٹھ گئے، ایک سیاسی مضمون لکھا، پیسے لیے اور ٹکٹ خرید کر گھر لوٹ آئے۔

اب ایک مناسب ملازمت یا کام کی تلاش شروع ہوئی۔ وہ کسی یونیورسٹی میں پڑھانے کا کام کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کی خود داری یا کسی کا پابند نہ رہنے کے احساس نے انھیں مجبور کیا کہ وہ ملازمت کی تلاش چھوڑ دیں، اور بس، وہ جی جان سے قومی کام میں ڈوب گئے۔ وہ اب انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہوگئے۔

سوشلسٹ پارٹی

جے پرکاش نرائن، اشوک مہتا، یوسف مہر علی اور اچھت پٹوردھن جیسے کچھ جوشیلے نوجوانوں نے ایک نیا گروپ 1934 میں قائم کیا۔ اسے "کانگریس سوشلسٹ پارٹی" کا نام دیا گیا تھا۔ اس تنظیم نے ایک ہفتہ واری اخبار "کانگریس سوشلسٹ" نام سے جاری کیا۔ لوہیا اس کے پہلے اڈیٹر مقرر ہوئے۔ لوہیا کے مضمونوں میں ان کے خیالات اور نظریوں کے نئے پن سے ہر شخص گہرا اثر لیتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان میں سوشلزم کی بنیاد لوہیا نے ہی رکھی۔

1936 میں لکھنؤ میں کانگریس کے اجلاس کی صدارت جواہر لال نہرو نے کی تھی۔ انھوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی (اے۔ آئی۔ سی۔ سی) میں ایک نیا شعبہ امورِ خارجہ (دوسرے ملکوں سے معاملات) کے لیے کھولا۔ نہرو جی نے لوہیا کو اس شعبے کا پہلا

سکریٹری مقرر کیا۔ اس سے ان کے گزارے برابر آمدنی کا مسئلہ تو حل ہو ہی گیا۔ اب وہ الہ آباد میں سوراج بھون میں ہی رہنے لگے اور وہیں کانگریس کے دفتر میں کام کرنے لگے۔ انھوں نے یہاں کامیابی کے ساتھ 1938 تک کام کیا اور پھر استعفیٰ دے دیا۔ اس عرصے میں وہ امور خارجہ یعنی دوسرے ملکوں سے تعلقات کے معاملے میں خصوصی ماہر اور بڑی گہری سمجھ بوجھ کے مالک مان لیے گئے۔ انھوں نے ہندوستان کی سیاسی سوچ یا تصور پر ایک کبھی نہ مٹنے والی چھاپ چھوڑی۔ اسی زمانے میں انھوں نے کچھ بہت اہم پالیسیوں کے بارے میں بھی لکھا۔ آنے والے برسوں میں کانگریس کے دوسرے ملکوں سے معاملات اور تعلقات (خارجہ پالیسی) کے سلسلے میں ان کے خیالات نے کافی گہرا اثر چھوڑا۔

1939 میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ لوہیا نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان اس جنگ میں کسی طرح بھی شریک ہو۔ چنانچہ انھوں نے جنگ کے سلسلے کی تمام کوششوں کی مخالفت کی۔ اس پر حکومت برطانیہ نے حکومت مخالف تقریریں کرنے کے الزام میں انھیں 24 مئی 1939 کو گرفتار کرلیا۔ لوہیا کی گرفتاری سے ملک کے نوجوان بھڑک اٹھے۔ چنانچہ حکومت نے اس آگ کے اور زیادہ بھڑک جانے سے ڈر کر انھیں اگلے دن رہا کر دیا۔ لوہیا نے کلکتہ کے پریسیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں اپنے خلاف مقدمے پر خود ہی بحث کی۔

لوہیا اس جنگ کو ہندوستان میں برطانوی راج کا تختہ پلٹ دینے کا ایک موقع مانتے تھے۔ انھوں نے گاندھی جی کے اخبار "ہریجن" میں ایک مضمون چھپوایا جس کا عنوان تھا "اب ستیاگرہ" (ستیاگرہ ناؤ)۔ یہ پہلی جون 1940 کو چھپا تھا اور 7 جون کو لوہیا کو سوراج بھون سے گرفتار کرلیا گیا۔ انھیں دو سال کی بامشقت قید کی سزا ہوئی۔ فیصلے پر دستخط کرتے ہوئے مجسٹریٹ نے کہا تھا "یہ شخص (لوہیا) بہت اعلا درجے کا عالم ہے، مہذب اور شریف آدمی ہے، آزاد خیال ہے اور بڑے مضبوط اصول اور کردار کا مالک ہے۔" سچ مچ سزا سناتے وقت کسی عہدے دار کے منہ سے کسی کے لیے ایسے الفاظ نکلیں۔۔۔

تعجب ہوتا ہے۔

گاندھی جی نے ہریجن" میں لوہیا کی گرفتاری پر اپنے غم اور غصے کا اظہار کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بمبئی میں کانگریس کمیٹی کی ایک میٹنگ میں گاندھی جی نے کہا۔ "میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھ سکتا جب تک لوہیا جیل میں ہیں۔ ابھی تک مجھے اس سے زیادہ بہادر اور اس سے زیادہ سیدھا سادہ آدمی نہیں ملا ہے۔ اس شخص نے تشدد (طاقت کے استعمال) کا پرچار کبھی نہیں کیا۔ اس نے اس موقع پر بھی جو کچھ کیا ہے اس سے اس کی قدر و منزلت بڑھی ہی ہے۔"

جون 1940 میں لوہیا کو دوسرے لیڈروں کے ساتھ بریلی سنٹرل جیل میں رکھا گیا۔ یہاں انھیں ذلیل کیا گیا اور جسمانی اور ذہنی سخت اذیتیں بھی دی گئیں۔ ہاتھوں اور پیروں میں بھاری بھاری ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈالی گئیں۔ برطانوی جیلر انھیں اور ان کے ساتھی دوسرے لیڈروں کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ لیکن لوہیا نے بڑی بہادری سے ان تمام زیادتیوں اور ظلموں کا مقابلہ کیا۔

دسمبر 1941 میں انھیں اور دوسرے لیڈروں کے ساتھ رہا کر دیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب جاپان مشرق سے تیزی سے ہندوستان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس وقت حکومت برطانیہ ہندوستان میں پوری طرح امن و امان قایم رکھنا چاہتی تھی۔

1942 کے اپریل میں لوہیا گاندھی جی کے ساتھ رہنے چلے گئے۔ انھوں نے گاندھی جی سے بڑی پر زور درخواست کی کہ وہ اس وقت ایشیا اور افریقہ کی غلام قوموں کی آزادی کی جنگ چھیڑ دیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے کئی مضمون بھی لکھے۔ انھوں نے ایک تحریر تیار کی جس میں حکومت برطانیہ کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے قومی پیمانے کی ایک تحریک چلانے کا نفسیاتی پس منظر اور منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ انھوں نے گاندھی جی پر یہ بات مان لینے کے لیے بہت دباؤ ڈالنے کی کوشش بھی کی کہ یہ آندولن یا احتجاج شروع کرنے کا سب سے

مناسب وقت "یہی" ہے۔

جنگ کے ہی زمانے میں لوہیا نے ہندوستانی شہروں کی نئی تعمیر کا ایک منصوبہ بھی پیش کیا۔ ان شہروں کے اس انوکھے منصوبے کو اس طرح تیار کیا گیا تھا کہ ان میں پولس یا فوج رکھنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ شہریوں کو خود اپنے شہر کا انتظام چلانا تھا۔ گاندھی جی نے اس منصوبے کو مان بھی لیا تھا۔ اس سلسلے میں وائسرائے کو انھوں نے ایک خط میں لکھا تھا۔ "عدم تشدد کے پابند، سوشلسٹ نے ہندوستانی شہروں کے لیے ایک نیا منصوبہ تیار کیا ہے جس کے ذریعے ان شہروں کو پولس اور فوج کی ضرورتوں سے آزاد قرار دیا جاسکتا ہے۔"

"ہندوستان چھوڑو"

اگست 1942 میں ہندوستان چھوڑو تحریک شروع ہوئی۔ گاندھی جی ہندوستان کے تمام بڑے رہنماؤں۔ نہرو، پٹیل، مولانا آزاد وغیرہ کے ساتھ گرفتار کرلیے گئے۔ مہاتما گاندھی "کرو یا مرو" کا نعرہ دے ہی چکے تھے۔ حکومت نے اس آندولن کو کچلنے کی کوشش کی۔ اس وقت ظلم وزیادتی اپنے عروج پر تھی۔ اس وقت ملک کے نوجوان اور گرم طبیعت لیڈروں نے سوچا کہ یہ وقت جیلوں میں پڑے سڑنے کا نہیں کچھ کرنے کا ہے۔ اس لیے انھوں نے گرفتاری سے بچے رہنے اور روپوش رہ کر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک ایک کام اپنے ذمے لیا اور بھیس بدل کر کاموں میں جٹ گئے۔ عورتوں میں اروناآصف علی، سچیتا کرپلانی، پورنیما بنرجی جیسی رہنما بھی روپوش ہوگئیں۔

لوہیا نے اپنے سپرد پوسٹر اور پمفلٹ وغیرہ کا کام کیا جو ایک خفیہ جگہ چھاپے جاتے تھے۔ "کرو یا مرو" کے باقاعدہ بلیٹن (اخبار) چھپتے تھے۔ لوہیا نے اوشامہتا کے ساتھ مل کر ایک خفیہ ریڈیو اسٹیشن بھی بمبئی میں قایم کردیا۔ اس کا نام تھا "کانگریس ریڈیو" یہ ملک

کے تمام شہریوں، یعنی "جنگ آزادی کے تمام سپاہیوں" کے لیے پیغامات اور حکم نشر کرتا تھا۔ لوہیا نے ہی اسے شروع کیا تھا اور وہی اس کے انچارج تھے۔ ان کی آواز ملک میں بہت سے لوگوں نے سنی اور پہچانی۔ "کانگریس ریڈیو" نے 94 دن کام کیا اور ہندوستان چھوڑو" تحریک کو ایک خاص ہمت اور رہنمائی فراہم کی۔ اس کے بعد لوہیا تحریک کو چلانے کے لیے نکلتے چلے گئے۔ وہاں وہ ایک دوسرے نام، مختلف لباس اور بدلے ہوئے بھیس میں کام کرتے رہے۔ انھیں وہاں لوگ ایک مارواڑی سیٹھ 'نتھیاجی' کے روپ میں جانتے تھے۔

لوہیا کے روپوشی کے زیادہ دن نیپال کے گھنے جنگلوں میں گزرے۔ یہاں یہ نیپالیوں کے ساتھ رہے اور ان کے مسئلوں، مشکلوں اور زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور یہیں انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ نیپال کی جنگ آزادی میں بھی شریک رہیں گے۔ اس وقت سے وہاں کے مشہور "کوئرالا برادران" ان کے زندگی بھر کے لیے دوست اور ساتھی بن گئے۔

جیل میں

حکومت برطانیہ ان کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ آخر زبردست تلاش کے بعد مئی 1944 میں لوہیا بمبئی میں حکومت کے ہاتھ آہی گئے۔ یہاں سے انھیں لاہور کے قلعے کی جیل لے جایا گیا جو قیدیوں کو اذیتیں دینے والی کوٹھریوں (ٹارچر سیل) کے لیے ملک بھر میں بدنام تھا۔ لوہیا کو ایک اکیلی کوٹھری میں رکھا گیا اور اب ان پر اذیتوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جو تکلیفیں انھوں نے وہاں جھیلیں وہ الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے اس حصے کے بارے میں خود بھی کچھ نہیں بتایا بلکہ وہ چاہتے تھے کہ کوئی دوسرا بھی اس کا ذکر کرکے انھیں وہ کڑوی یاد نہ دلائے۔ حالانکہ ان کے عزم اور ارادے میں کوئی دراڑ نہیں آئی مگر جسمانی طور پر وہ ٹوٹ سے گئے۔ ان کی باقی ساری زندگی کے

لیے ان کی صحت خراب ہوگئی۔ اس کے بعد ان کا بلڈ پریشر کبھی نارمل نہ رہ سکا۔ وہ پورے چھ مہینے اس تنہا کوٹھری میں دن رات ذہنی اور جسمانی اذیتیں جھیلتے رہے۔ پھر ان کو دی جانے والی اذیتوں کی اڑتی اڑتی کچھ خبریں ان کے دوستوں کے کانوں تک پہنچیں۔ قانون کے ماہروں نے اس سلسلے میں حکومت کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کی بھی کوشش کی، اور نتیجے میں انھیں بھی گرفتار کرلیا گیا۔

آخر لوہیا نے خود جیسے تیسے ایک خط لاہور جیل میں لکھا اور اسے چھپے چوری برطانیہ کی لیبر پارٹی کے لیڈر پروفیسر ہیرالڈ جے۔ لاسکی کو بھجوانے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ خط ایک یادگار سیاسی دستاویز ہے۔ انگلستان اور ہندوستان کے تمام جانے مانے اخباروں میں موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ اس خط کو پہلے صفحے پر چھاپا گیا۔ پھر لوہیا نے اپنے خلاف باقاعدہ مقدمہ چلائے جانے کے لیے قانونی کوششیں بھی کیں۔ آخر کار ایک کافی بڑے احتجاج اور عوام کی رائے کے دباؤ کے سامنے حکومت برطانیہ کو جھکنا ہی پڑا۔ جے پرکاش نرائن اور لوہیا دونوں کو آگرہ سنٹرل جیل منتقل کردیا گیا۔ کم سے کم یہاں ان کے ساتھ زیادہ بہتر اور کچھ انسانی سلوک روا رکھا گیا۔

لوہیا کے اپنے عزیزوں میں صرف ایک بوڑھے باپ ہی تھے، وہ بھی جب رام منوہر آگرہ جیل میں تھے اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ رام منوہر لوہیا کو اپنے باپ کی آخری رسمیں ادا کرنے کے لیے جیل سے عارضی چھٹی (پیرول) مل سکتی تھی مگر خود انھوں نے ہی انکار کردیا۔ ان کے والد کی آخری رسوم ادا کرنے کے لیے کلکتہ میں ان کے دوستوں، ساتھیوں اور شاگردوں کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں عام لوگ شریک ہوئے۔ اور پھر جب قید سے رہائی کے بعد لوہیا 1946 میں کلکتہ گئے تو شہر میں ان کا استقبال ایک بڑے ہیرو کی طرح کیا گیا۔

گاندھی جی کے بہت زور دینے پر حکومت کو جے پرکاش نرائن اور لوہیا کو 11 اپریل

1946 کو رہا کرنا پڑا۔ اس وقت جیل کے دروازے پر ہزاروں نوجوان ان کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ جیل کے دروازے سے انھیں بہت بڑے جلوس کے ساتھ آگرہ کی سڑکوں پر گھمایا گیا۔ آگرہ میں اس سے پہلے لوگوں میں اتنا جوش و خروش دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ یہ آج ایک لمبی مدت کی قید اور سخت اذیتوں کے بعد کھلی ہوا میں آزادی سے سانس لے رہے تھے۔ اب ماحول میں آزادی اور فتح کا سا احساس پیدا ہو چکا تھا۔

گوا میں

لوہیا کی صحت جواب دے رہی تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنے ایک دوست جولیو مینزس کی دعوت پر گوا جا کر کچھ دن آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر ایسے لوگوں کی قسمت میں آرام کہاں؟ وہاں گوا کے لوگوں کی حالت دیکھ کر ان کا دل بے چین ہو گیا۔ ان کی حالت تو ان کے ہندوستانی بھائیوں سے بھی بدتر تھی۔ ہر طرح کی شہری اور سماجی آزادی ان سے چھینی جا چکی تھی۔ عوام پر حکومت کا دباؤ بڑا سخت تھا۔ گوا پرتگالیوں کی ایک نوآبادی (کالونی) تھا اور وہ اس پر پوری سختی سے حکومت کرتے تھے۔ گوا کے لوگوں کو تو تقریر کرنے اور جمع ہو کر کوئی بات کہنے سننے کی بھی آزادی نہیں تھی۔

لوہیا 10 جون 1946 کو گوا پہنچے تھے۔ 18 جون کو انھیں مرگاؤں میں ایک تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا۔ اس دھواں دھار اور شعلہ بیان مقرر کو سننے کے لیے ہزاروں لوگ جمع ہوئے۔ مگر پولس کمشنر نے انھیں بولنے نہیں دیا اور انھیں گرفتار کر لیا۔ مگر ان کی گرفتاری کے بعد ان کی تقریر کی چھپی ہوئی نقلیں تمام مجمع میں تقسیم کی گئیں۔ اس تقریر کو ہندوستان کے بہت سے اخباروں نے بھی چھاپا۔ اس میں لوہیا نے کہا تھا۔ "گوا کے لوگوں کا دل درد اور غم سے بھرا ہوا ہے۔ ان کی نگاہیں ہندوستان پر لگی ہوئی ہیں۔ میں گوا کے حاکموں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا کیونکہ ہندوستان میں جب حکومت برطانیہ ختم ہو سکتی ہے تو

پرتگالی حکومت کا گوا میں ختم ہوجانا لازمی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی ان کی زندگی میں ایک اور نئی جنگ شروع ہوئی جو فتح پر ہی ختم ہوئی۔ لوہیا کو 18 جون کو گرفتار کیا گیا مگر اگلے دن رہا کردیا گیا۔ اس احتجاج کے نتیجے میں گوا کے لوگوں کو حکومت سے اجازت لیے بغیر جمع ہونے اور جلسہ کرنے کی آزادی حاصل ہوگئی، اور اس احتجاج نے ہریجن، میں گورنر گوا کے نام ایک کھلا خط چھاپا۔ لوہیا کی تعریف کرتے ہوئے گاندھی جی نے لکھا۔ "آپ کو اور گوا کے لوگوں، دونوں کو ڈاکٹر لوہیا کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے ــــ (شہری حقوق کی لڑائی کی) مشعل روشن کردی۔"

ستمبر کی 29 تاریخ کو لوہیا پھر گوا کی طرف چلے مگر انھیں سرحد کے اسٹیشن "کالم" پر گرفتار کرلیا گیا اور اگواڈا قلعے کی جیل بھیج دیا گیا۔ مہاتما گاندھی کی کوششوں کے نتیجے میں انھیں دس دن بعد چھوڑ دیا گیا۔ لوہیا نے گوا کی جنگ آزادی کو چلاتے رہنے کے لیے روپیہ اور رضاکار (والنیٹر) دونوں جمع کیے۔ گوا کے لوگوں کے لیے لوہیا نے جو کچھ کیا اس کے لیے بھی انھیں کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ گوا کی عورتوں نے تو اپنے لوک گیتوں میں لوہیا کے نام کو امر کردیا۔

آزادی کے بعد

آخر 1947 آہی گیا۔ برطانیہ کے وزیر اعظم ایٹلی نے اعلان کردیا کہ ہندوستان میں برطانوی راج جون 1947 میں ختم کردیا جائے گا۔ مگر اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک جال بھی پھیلادیا۔ یہ لوگ ملک کو بانٹ دینا چاہتے تھے۔ دونوں گروپوں کے لیڈروں کو مجبور کردیا گیا کہ وہ بٹوارے کو تسلیم کرلیں۔ لوہیا اس بات سے بے حد بےچین تھے کہ مادر وطن کے یوں ٹکڑے ٹکڑے کردیے جائیں۔ انھوں نے بھی اپنے بس بھر تقسیم کی مخالفت کی مگر اکثریت کے سامنے ان کی کچھ نہ چلی۔

اور پھر جب ملک والوں پر فرقہ واری دیوانے پن کا سخت دورہ پڑا تو اس ظلم وتشدد کے خلاف کام کرنے کے لیے لوہیا بھی گاندھی جی کے ساتھ کلکتہ اور نواکھالی میں کام میں جٹ گئے۔ اس زمانے میں وہ گاندھی جی کے بہت قریب آگئے۔ مہاتما گاندھی نے لوہیا کو ہریجن کالونی، دہلی، میں کوئی بہت اہم بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔ لوہیا فوراً پہنچے۔ لیکن دو دن گزر گئے مگر بات چیت کا موقع نہ آیا۔ لوہیا ان کے پاس گئے بھی اور ان کو یاد دلایا۔ "باپو۔۔۔ آپ مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے تھے۔ مگر ابھی تک آپ نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔"

گاندھی جی نے جواب دیا "جس وقت میرے پاس کچھ وقت تھا تو میں نے دیکھا، تم گہری نیند سو رہے ہو۔ میں نے تمہیں اٹھانا اچھا نہ سمجھا۔ تمہیں اٹھانا بڑی زیادتی ہوتی۔"

باپو کے دل میں لوہیا کے لیے اتنا خیال ہے اس سے لوہیا کے دل پر بہت اثر ہوا۔

اور دو دن بعد گاندھی جی ایک قاتل کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ اور وہ اہم بات چیت، نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ لوہیا جو اپنے باپ کی موت پر بھی نہیں روئے تھے اب پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ انھوں نے آنسوؤں سے رندھی آواز میں کہا۔ "باپو کی موت سے میں آج یتیم ہوا ہوں۔"

آزادی کے بعد بھی ڈاکٹر لوہیا کے کام کچھ انوکھے ہی رہے۔ وہ پوری زندگی ایک باغی کا کردار ادا کرتے رہے، نہ سیاست میں کوئی بڑی جگہ حاصل کی نہ حکومت میں کوئی اعلا عہدہ۔ بلکہ عوامی مسئلوں کو اٹھانے اور انھیں حکومت اور عوام کے سامنے اجاگر کرنے کے لیے انھوں نے اپنے لیے پریشانیوں کو دعوت دی اور گرفتاری کے لیے خود کو پیش کیا۔ وہ عوام کی سماجی، معاشی ترقی اور بہتری کے لیے انتھک جدوجہد کرتے رہے۔ مثال کے طور پر یہ ڈاکٹر لوہیا ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے "غیری ہٹاؤ" کا نعرہ دیا تھا۔ اسی کو بعد میں مسز اندرا گاندھی نے اپنایا، مگر ان کی مراد وہ نہیں تھی جو لوہیا کی تھی۔ ڈاکٹر لوہیا میں ہی یہ جرات بھی تھی کہ ملک کی اقلیتوں، عورتوں کمزور اور دوسرے پچھڑے

ہوئے لوگوں کے لیے اپنی حکومت آنے پر 60 فیصدی رزرویشن کا اعلان کر سکیں۔ اس منصوبے کو بعد میں جنتا پارٹی کی حکومت نے اپنالیا۔

ڈاکٹر لوہیا کے اپنے کچھ بہت سخت اصول تھے اور وہ کچھ چیزوں پر اٹل یقین رکھتے تھے۔ اور پھر اس اٹل یقین اور پکے اصولوں سے جو نتیجے پیدا ہوتے تھے ان کی ذمے داری اور اثرات کو پوری طرح قبول کرنے کی ہمت بھی ان میں تھی۔ ان پروگراموں سے جنھیں انھوں نے شروع کیا ان کے دل میں عوام کے لیے جو احساس اور ان کی اہمیت تھی اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ لوہیا نے ہندوستان کی سیاسی سوچ اور دنیا کی سوشلسٹ تحریک پر بڑی گہری چھاپ چھوڑی۔

ان کے مقاصد

ان کی گہری فکر اور پوری زندگی کی انتھک جدوجہد کو مختصر طور پر اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

لوہیا نے برطانیہ کے دیے ہوئے "دو قومی" نظریے (تھیوری) کی مخالفت کی۔ مگر بہرحال پاکستان بنا۔ پھر ڈاکٹر لوہیا کا ماننا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان مل جل کر (ایک وفاق یا کنفیڈریشن کے روپ میں) کام کریں کیونکہ یہ دونوں ملک کئی دھموں سے پہلے سے ہی متحد ہیں۔۔۔ جغرافیائی، تاریخ اور رہن سہن (کلچر) کے اعتبار سے یہ ایک ہی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ چاہے حکومتیں لڑتی رہیں لیکن دونوں بھائیوں۔ ہندو مسلمانوں۔ کو آپس میں نہیں لڑنا چاہیے۔

ڈاکٹر لوہیا نے ہی سب سے پہلے یہ بات بھی یاد دلائی تھی کہ ملک کی سالمیت اور اتحاد کے لیے 650 آزاد ریاستیں بہت بڑا خطرہ ہیں۔ بعد میں سردار پٹیل نے ان تمام ریاستوں کو انڈین یونین (ہندوستان) میں ملالیا۔

ڈاکٹر لوہیا نے ہی "ہمارا اپنا ملک ہماری اپنی زبان" کی بات بھی سب سے پہلے

اٹھائی۔ انھوں نے تمام علاقوں کی زبانوں کی اٹھان اور ترقی کی بات کہی جس میں ہندی قومی زبان کے روپ میں ایک رشتے یا رابطے کی زبان کا کردار ادا کرے۔ انھوں نے کہا تھا کہ "ہمیں یہ انتظار نہیں کرنا چاہئے کہ جب ہندی ترقی کرلے تب اسے قومی زبان بنایا جائے۔ پہلے اسے قومی زبان بنادیجیے پھر آہستہ آہستہ استعمال کے ساتھ ساتھ یہ خود ترقی کرکے مضبوط ہوجائے گی۔" لوہیا خود دو غیر ملکی زبانوں کے ماہر تھے۔ جرمن اور انگریزی۔ مگر یہ اپنے ذاتی معاملات اور لکھنے پڑھنے میں ہندی ہی استعمال کرتے تھے۔ لوک سبھا میں بھی یہ ہمیشہ ہندی میں ہی تقریر کرتے تھے۔ 1965 میں لوہیا نے "انگریزی ہٹاؤ" کی تحریک بھی شروع کی۔ انھوں نے انگریزی میں ایک مضمون لکھا "ہندی یہاں اور ابھی" (ہندی ہیئر اینڈ ناؤ) اس میں انھوں نے کہا "انگریزی کے استعمال سے بنیادی (اور یجنل) سوچ میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، اس کے استعمال سے ہمیں اپنے کمتر ہونے کا احساس ہوتا ہے اور اس سے پڑھے لکھوں اور ان پڑھ لوگوں کے درمیان ایک کھائی یا دوری پیدا ہوتی ہے۔ آئیے ہم ہندی کو اس کی صحیح اور شاندار جگہ دلوانے کے لیے متحد ہوجائیں۔" مگر اس سب کے باوجود وہ ہندی زبان کو کسی علاقے پر تھوپنا نہیں چاہتے تھے۔

لوہیا حکومت کی دوہری تعلیمی پالیسی کے بھی خلاف تھے جس میں امیروں کے بچوں کے لیے اعلا درجے کے اسکول کھولنے کی اجازت ہوتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس سے ایک نیا طبقاتی نظام یا درجہ بندی پیدا ہوجائے گی۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ پبلک اسکول بند کردیے جائیں اور جو اسکول (سرکاری) موجود ہیں انھیں بہتر کرکے اعلا معیار کے اسکول بنادیے جائیں۔

سوشلسٹ پارٹی کا سالانہ اجلاس (کنونشن) پٹنہ میں 1949 میں ہوا۔ اس میں لوہیا نے "آگے بڑھو" کا نعرہ دیا۔ انھوں نے حکومت کے انتظامیہ کے لیے چار درجے قایم کرنے کا ایک منصوبہ پیش کیا (اسے چوکھمبا راج، کا نام دیا گیا) اس نظام کے چار ستون تھے (1)

گاؤں، (2) ضلع، (3) ریاست (صوبہ) اور (4) مرکز۔ اس منصوبے میں حکومت یا طاقت کے ڈھانچے کو مرکز سے ہٹاکر چار حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ اس طریقہ کار میں سب سے نچلے درجے سے سب سے اوپر درجے تک حکومت کے کاموں میں عام آدمی کی حصہ داری کافی بڑھ جاتی تھی۔ اس میں حکومت کے تمام کاموں۔۔۔ تعلیم، منصوبہ بندی، پولس اور فوج وغیرہ۔۔۔ کو غیر مرکزی بناکر تقسیم کردیا جانا تھا۔ مثال کے طور پر ریلویز اور ملک کی قومی شاہراہوں (سڑکوں) کا انتظام مرکزی حکومت کے پاس رہے گا، مقامی آمدورفت (ٹرانسپورٹ) ضلع کی ذمہ داری ہوگی۔ یہ سب سے نچلے درجے پر جمہوری نظام قائم کرنے کے لیے بڑا اچھوتا پروگرام تھا۔

معاشیات پر لوہیا کے خیالات ان کی کتاب "سوشلسٹ معاشیات" (سوشلسٹ اکانومی) میں ملتے ہیں۔ اس قسم کے معاشی نظام میں سب سے پہلی بات یہ ہوتی ہے کہ ملک میں پیداوار کے تمام ذرائع کی حکومت مالک ہوتی ہے۔ قومی ملکیت یا دولت کو ہمیشہ بڑھتے رہنا چاہیئے اور اس کے لیے پیداوار کا لگاتار بڑھتے رہنا ضروری ہے۔ جہاں تک ممکن ہو چھوٹے پیمانے کی صنعتیں ہونی چاہئیں اور ان میں چھوٹے ہی پیمانے کی مشینیں استعمال ہونی چاہئیں۔ چھوٹے پیمانے پر پیداوار کا مطلب ہوگا معاشی طاقت کا چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم (غیر مرکزی) ہونا اور زیادہ لوگوں کو روزگار کے موقع ملنا۔ لوہیا نے غریب کسانوں کے مسئلے کو بھی اٹھایا۔ انھوں نے 1950 میں "ہند کسان پنچایت" قایم کی جس کے ذریعے غریب کسانوں کی دقتوں اور پریشانیوں۔۔۔ گنے کی اچھی قیمت، سنچائی کے پانی کے لیے وصولی کی دروں جیسی مانگوں کو اٹھایا جانا تھا۔

لوہیا نے اور کئی تعمیری پروگرام شروع کیے۔ گاندھی جی نے ملک کی تعمیر اور ترقی کے لیے چرخے کو ایک اوزار یا نشان کے طور پر پیش کیا تھا، لیکن ڈاکٹر لوہیا کے لیے یہ پھاوڑا تھا۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ پھاوڑا اٹھائیں اور چھوٹے چھوٹے تالاب

نہریں، کنوئیں اور سڑکیں بنائیں جس میں وہ رضاکارانہ طور پر اپنی محنت یا مزدوری شامل کردیں۔ ان کے کہنے کے مطابق سماج کی طرف سے رضاکارانہ طور پر کی گئی مزدوری لوگوں میں ایکتا اور مسئلوں کی جانکاری پیدا کرے گی اور ان کے سامنے اٹھنے والے روز مرہ کے مسئلوں کو بھی حل کرنے میں مدد دے گی۔" انھوں نے بلند شہر میں تین سو ایکڑ میں نہریں کھودنے کے کام کی ابتدا بھی کی تھی۔ پتھریدی گاؤں کے لوگوں نے پنیاری دریا کے دونوں طرف کی پہاڑیوں کے درمیان ایک باندھ بھی بنایا اور اس کا نام "لوہیا ساگر ڈیم" رکھا۔ لوہیا کہا کرتے تھے "کسی تعمیری پروگرام بغیر ستیاگرہ اس حملے کی طرح ہے جس میں فعل نہ ہو۔"

لوہیا تخریب (تباہ) کار یا کچھ نہ کرنے والے (منفی) سیاست داں نہیں تھے، جیسا کہ ان پر کچھ نکتہ چینی کرنے والے کہتے ہیں۔ وہ اپنے تصورات اور خیالات میں تعمیری بھی تھے اور کچھ کر دکھانے والے (مثبت) بھی۔ لوہیا کے نزدیک تعمیری پروگراموں کا مطلب تھا روزگار اور غریبوں کے لیے روٹی کپڑا اور مکان۔

لوہیا جو ہر طرف نگاہ رکھتے تھے ان کی رہنمائی میں 3 جون 1951 کو دلی میں "جن وانی دن" کے طور پر منایا گیا۔ یہ وہ پہلا دن تھا جب ہمارے ملک کے لوگ پہلی بار اپنی شکایتیں لے کر پارلیمنٹ پہنچے تھے۔ اسی لیے اسے "جن وانی" (جنتا کی آواز کا) دن کہا گیا۔ یہ بڑا زبردست اور کامیاب مظاہرہ تھا۔

لوہیا خود سوشلسٹ تھے اور ہندوستان اور پورے ایشیا میں سوشلسٹ تحریک کو منظم کرنے والے رہنما۔ ان کی کوشش اور نگاہ تو دنیا بھر کے سوشلسٹوں کو منظم کرنے پر تھی۔ اسی مقصد سے وہ جولائی 1951 میں سٹاک ہوم میں دنیا کے سوشلسٹوں کی بین الاقوامی کانگریس (انٹرنیشنل کانگریس آف ورلڈ سوشلسٹس) میں شرکت کرنے بھی گئے تھے۔ یہاں انھوں نے ایک "تیسرے عالمی کیمپ" (تھرڈ ورلڈ کیمپ) کے تصور پر بھی کافی زور دیا۔

جس کا مطلب تھا ایشیائی اور افریقی سوشلسٹوں کا اتحاد، ڈاکٹر لوہیا کی کوششیں کافی حد تک کامیاب بھی ہوئیں۔ مارچ 1952 میں پہلی ایشیائی سوشلسٹ کانفرنس رنگون میں قایم ہوئی۔

لوہیا عدم تشدد پر بہت پکا یقین رکھتے تھے۔ 1953 میں ریاست ٹروانکور کوچین میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کی ایک میٹنگ تھی۔ وہاں بھیڑ پر پولس نے گولی چلائی۔ ڈاکٹر لوہیا اس وقت پرجا سوشلسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے۔ انھوں نے اس مسئلے پر اپنی ہی پارٹی کے چیف منسٹر سے استعفیٰ دینے کی مانگ کی، اور جب انھوں نے استعفیٰ نہیں دیا تو احتجاج کے طور پر لوہیا نے خود استعفیٰ دے دیا۔ "آزاد ہندوستان میں پولس نہتے اور کسی طرح بھی نقصان نہ پہنچا سکنے والے (بے ضرر) شہریوں پر کیسے گولی چلا سکتی ہے؟"

لوہیا صحیح معنوں میں فولادی انسان تھے۔ ہر مشکل اور ہر پریشانی میں وہ اٹل کھڑے رہے۔ 1942 میں "ہندوستان چھوڑو" تحریک کے دوران وہ روپوش رہے۔ اس طرح بھیس بدل کر زندگی گزارنے میں نہ ان کے سر پر کوئی مستقل سایہ تھا نہ کسی چیز کا بھروسا۔ مگر انھوں نے ہر پریشانی اور تکلیف کو پوری ہمت اور جرات سے برداشت کیا۔ پھر انھیں لاہور جیل میں ڈال دیا گیا جہاں انھیں ایک سخت کرسی پر بٹھا دیا جاتا تھا اور کئی دن رات تک انھیں آنکھ بھی جھپکنے نہیں دی جاتی تھی۔ ان کے ہاتھوں پیروں میں بھاری بھاری زنجیریں اور ہتھکڑیاں ڈال کر اوبڑ کھابڑ زمین پر کھینچا جاتا تھا۔ انھیں طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی تھیں اور طرح طرح سے انھیں ذلیل کیا جاتا تھا۔ لیکن جب برطانوی جیلر نے مہاتما گاندھی کے لیے غلط لفظ استعمال کیے، اس وقت یہ ضرور شیر کی طرح گرجے۔ "زبان بند۔۔۔! قلعے کے بزدل نوکر!"

گوا کی آزادی کی تحریک کا دور تھا۔ لوہیا کو مزگاؤں میں ہزاروں لوگوں کے سامنے تقریر کرنی تھی۔ گوا کا حاکم (اڈمنسٹریٹر) مرانڈا کچھ ضرورت سے زیادہ ہی بھڑک اٹھا۔ وہ ریوالور اٹھائے لوہیا پر جھپٹا۔ نہتے لوہیا بڑے سکون سے وہیں کھڑے رہے۔ جب مرانڈا ان کے

بالکل پاس آگیا تو انھوں نے اس کا ریوالور والا ہاتھ پکڑلیا اور یہ کہتے ہوئے نیچے کردیا۔ "تھوڑے سکون سے کام لو۔۔۔ دیکھتے نہیں یہاں کتنے لوگ جمع ہیں۔ اگر یہاں خون بہا تب کیسے امن قائم کروگے؟"

جس زمانے میں وہ بچے تھے تو ان کے چچا نے ایک بار پوچھا تھا "بڑے ہوکر تم کیا کرنا چاہوگے؟"

اور لوہیا نے فوراً جواب دیا تھا "ایک ٹولی بناؤں گا جو کروڑ پتیوں کا صفایا کردے گی۔"

سچ بات تو یہ ہے کہ لوہیا ظالموں کی نیند حرام کردینے والے، غریبوں کے لیے آس وامید، بچھڑے ہوئے لوگوں کے دل کی ڈھارس، بے زبانوں کی زبان اور کمزور اور ناتوانوں کے لیے طاقت اور توانائی تھے۔ پوری زندگی میں وہ اٹھارہ بار جیل گئے لیکن سماجی انصاف کی لڑائی ہر حال میں جاری رکھی۔

لوہیا بنیادی طور پر ایک انسان دوست تھے جو ہر شخص اور نیچے سے نیچے طبقے کے انسانوں کی قدر کرتا ہے۔ 1965 میں لوہیا یو۔ ایس۔ اے گئے۔ وہاں انھیں ایک ریستوران میں۔۔۔ جو صرف گورے لوگوں کے لیے رزرو تھا، داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ڈاکٹر لوہیا بھی اڑ گئے۔ انھیں امریکی پولس نے گرفتار کرلیا، مگر جب انھیں پتہ چلا کہ یہ ہندوستان کے بہت بڑے لیڈر ہیں تو انھیں چھوڑ دیا گیا۔ ایک امریکی افسر نے آگے بڑھ کر زبانی معافی مانگی۔ لوہیا نے غصے میں جواب دیا۔ "تم مجھ سے کیوں معافی مانگتے ہو، امریکہ کے صدر کو ان تمام کالے لوگوں سے معافی مانگنی چاہیے جنھیں گوروں کی ناانصافیاں اور زیادتیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔"

لوہیا کے ذہن میں ایک ایسی سوسائٹی کا تصور تھا جس میں نہ کوئی ذات پات کا فرق ہوگا نہ طبقے یا درجے کا، اس میں نہ کسی قسم کی معاشی چھینا جھپٹی (استحصال) ہوگی نہ کسی کا حق مارا جائے گا۔ انھوں نے اپنے ان خیالات کا پرچار کرنے کے لیے "انسان"

(مین کائنڈ) نام کا ایک رسالہ بھی 1956 سے نکالنا شروع کیا تھا۔

لوہیا نے جو جو تحریکیں شروع کیں ان سے ان کا سوشلزم۔ یعنی تمام انسانوں کی مساوات۔ پر ایک پختہ یقین کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ "نکڑ سوشلزم" (بالکل معمولی آدمیوں کا سماج واد) پر یقین رکھتے تھے، جس کا مطلب تھا کہ طاقت سڑک پر چلتے ہوئے عام آدمی کے ہاتھوں تک پہنچا دی جائے۔

1963 میں لوہیا لوک سبھا میں داخل ہوئے اور اپنا اثر بھی قائم کیا۔ ان کے مضبوط اور اٹل قسم کے خیالات اور باغیانہ قسم کی شخصیت لوک سبھا کے ماحول کو کافی گرم رکھتی تھی۔ انھوں نے غریبی کے سوال پر وزیر اعظم نہرو تک کو للکار دیا۔ لوہیا نے پورے اعداد وشمار کی بنیاد پر ثابت کر دیا کہ ملک کے اٹھارہ کرور لوگ صرف تین آنے (18 پیسے) فی کس روزانہ کی آمدنی پر جیتے ہیں۔ پارلیمنٹ میں ان کی وجہ سے گفتگو میں گرما گرمی، نوک جھونک اور چٹپٹاپن تو ضرور پیدا ہوتا تھا مگر وہ اپنی کہی ہوئی بات یا موقف پر مضبوطی سے قایم بھی رہتے تھے۔

"دنیا کے شہری" کے تصور پر یقین رکھتے ہوئے لوہیا نے حکومت ہند سے کہا کہ وہ اسٹالین کی بیٹی سویتلانا کو ہندوستان کا شہری تسلیم کرلے مگر حکومت نے انکار کر دیا۔ ان کی طرف سے جو سب سے اہم تجویز آئی وہ یہ تھی کہ حکومت خود اپنے کاموں پر خرچ میں کٹوتی کرے۔ انھوں نے برابر بڑھتی ہوئی قیمتوں پر مکمل پابندی لگا دینے پر بھی زور دیا۔

ڈاکٹر لوہیا کی تجویزیں ہر طرح سے مکمل ہوتی تھیں۔ ان میں آپسی اختلاف یا تضاد نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہندوستان سے اگر ذات پات کے نظام کو ختم کرنا چاہتے تھے تو دنیا میں گورے کالے میں امتیاز (اپارتھیڈ) کے بھی مخالف تھے۔ وہ ملک کے مختلف طبقوں میں سماجی نابرابری اور معاشی استحصال (لوگوں کی کمزوری سے بے جا مالی فائدہ حاصل کرلے) کو بھی برا سمجھتے تھے تو اسی بات کو قوموں کے درمیان بھی غلط مانتے تھے۔ وہ اپنی پوری

زندگی سرمایہ داری نظام (امپیریلزم) اور نوآبادیاتی نظام (کولونیلزم) دونوں کے خلاف لڑتے رہے۔ وہ ایشیائی اور افریقی قوموں کو ملے جلے انداز میں دوبارہ منظم کرنا چاہتے تھے۔ وہ پہلے ایک "عالمی ترقیاتی کاؤنسل" (ورلڈ ڈولپمنٹ کاؤنسل) بنانا چاہتے تھے جو آگے چل کر "عالمی حکومت" میں بدل جاتی۔ وہ عالمی امن کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے۔

جب وہ کوئی نو سال کے تھے تو انھوں نے دیکھا تھا کہ ایک 18۔19 برس کا لڑکا اپنے سے چھوٹے ایک لڑکے کی پٹائی لگا رہا ہے۔ رام منوہر اپنے دبلے پتلے جسم اور کم طاقتور ہونے کے باوجود اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس بچے کو بچانے کے لیے آگے بڑھ آئے تھے۔ چنانچہ ان کی غیر معمولی ہمت اور جرات دیکھ کر بڑا لڑکا ڈر کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ ایک بار انھوں نے ایک غریب اور اپاہج پیاسے کے لیے کنوئیں سے پانی کھینچ کر پلایا تھا اور اس سے انھیں اتنی مسرت اور سکون محسوس ہوا تھا کہ انھوں نے زندگی بھر غریبوں اور کچلے ہوئے بے سہارا لوگوں کے لیے کام کرنے کو اپنا مقصد بنالیا تھا۔

ان کے کردار میں مارکس کا فلسفہ مہاتما گاندھی کا کرم، (عمل) اور گوتم بدھ کی درمندی سب ایک ساتھ جمع ہوگئے تھے۔

لوہیا دنیا کے عظیم سائنس داں آئنسٹائن سے 23 جولائی 1951 کو امریکہ میں ملے تھے اور آئنسٹائن نے ان کے آزاد ذہن، کی تعریف کی تھی۔

ان کا پیدائشی وطن کیونکہ فیض آباد تھا اس لیے وہ خود کو دریائے سریو کا بیٹا، اور "ایودھیا کا بیٹا" کہا کرتے تھے۔ ہندوستان کے عوامی یا لوک کلچر سے محبت کے اثر سے انھوں نے "رامائن میلے" بھی شروع کیے۔

ڈاکٹر لوہیا نے شادی نہیں کی تھی نہ ان کا اپنا کوئی گھر تھا۔ انھوں نے پوری زندگی ایک بھاگتے دوڑتے خانہ بدوش کی طرح گزاری۔ ان کی آمدنی کا خاص ذریعہ صرف ان کی کتابوں یا مضمونوں سے ہی تھا۔ جو انھوں نے بہت بڑی تعداد میں لکھے تھے۔ ان کے

دوست بھی بہت تھے ـــ مرد، عورتیں دونوں، جن کے ساتھ وہ اکثر رہتے بھی تھے۔ پھر جب وہ پارلیمنٹ کے ممبر ہوگئے تو ان کی ایک باقاعدہ آمدنی کا سلسلہ بھی ہوگیا۔

ان کا ایک ملازم تھا جو ان کا کھانا پکاتا تھا اور ان کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا۔ وہ بھی ملازم سے زیادہ ان کا دوست اور ساتھی تھا۔ لوہیا کو سفید کھادی کی دھوتی کرتا جواہر کٹ اور چپلوں کا لباس سب سے اچھا لگتا تھا۔ ان کا اپنا سامان بہت ہی کم تھا۔

جتنے عرصے وہ دلی میں رہتے ان کی شامیں کناٹ پلیس کے کافی ہاؤس میں گزرتیں۔ وہ گھنٹوں نوجوانوں میں گھرے بیٹھے رہتے اور صرف سیاست پر ہی نہیں، سنیما، آرٹ، ادب، ہر چیز پر بات چیت کرتے۔ ان کے چاہنے والوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔

30 ستمبر 1967 کو نئی دلی میں ان کا آپریشن ہوا۔ یوں تو یہ سیدھا سادا آپریشن تھا لیکن بعد میں اس میں کچھ پریشانیاں پیدا ہوگئیں۔ اور بہت سے لوگوں کے محبوب نیتا نے 12 اکتوبر 1967 کو ایک بج کر پانچ منٹ پر آخری سانس لی۔ نہ انھوں نے اپنی کوئی ملکیت چھوڑی نہ بینک میں کچھ روپیہ ـــ جو کچھ چھوڑا وہ ان کے خیالات تھے اور کچھ وہ لوگ جو انھیں پسند کرتے تھے۔

ڈاکٹر لوہیا میں وہ کیا خاص بات تھی جس کی وجہ سے وہ ایک عظیم اور انوکھے کردار کے مالک مانے جاتے ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ وہ اس دور کی باغیانہ لیکن اصولوں اور قاعدوں کی پابند سیاست میں ایک ہمیشہ یاد کی جانے والی رزمیہ داستان کی طرح رہیں گے۔ انھوں نے جمہوریت اور سوشلزم کو بھٹکنے سے بچانے کے لیے اپنے دمے کچھ چوکیداری کا سا کام لے لیا تھا۔ وہ ہر قسم کی نابرابری کے بھی دشمن تھے۔ وہ ایک دھماکے دار شخصیت کے مالک تھے۔ "انسانوں کو گندگی اور اس پر بیٹھی مکھیاں مت سمجھو" وہ اپنی آواز کی آخری حد پر چیخ پڑتے۔ وہ پھانسی پر لٹکانے کی سزا کو بربریت، مانتے تھے۔ ڈاکٹر لوہیا کی سیاست کو غیر انسانی سیاست کے مقابلے میں "انسانی سیاست" کہا جاتا ہے۔

انھیں "بے باک اور نڈر لوہیا" بھی کہا جاتا تھا۔ "ایک اکیلی ذات جو اپنے اٹل ارادے اور بے روک ٹوک جرات سے سلطنتوں کو اکھاڑ پھینک سکتی تھی۔" اس ملک میں لیڈر تو بہت ہوئے ہیں مگر لوہیا ایک ہی ہوا ہے۔

"لوگ میری بات ضرور سنیں گے۔ مگر شاید میرے بعد۔ بہر حال انھیں سننا تو ضرور پڑے گی۔ اصل میں ضرورت جس چیز کی ہے وہ ہے ایک نئی طرح کی رہنمائی یا لیڈر شپ، اور خود عوام میں ایک نئی صلاحیت یا خصوصیت کی۔۔۔ اور انہی عوام میں وہ نیا لیڈر بھی ہوگا۔ آج ہندوستانی سیاست کے اسٹیج پر جو "چھٹ بھیئے" قسم کے لیڈر زرق برق لباس پہنے اکڑ اکڑ کر چلتے پھرتے نظر آرہے ہیں ان کے بدلے میں وہ نیا لیڈر شاید اپنے عوام پر زیادہ بڑا جادو کر سکے گا۔ لوگ اسے شاید اپنا محافظ اور نجات دلانے والا سمجھیں گے۔ مگر اپنے عوام کو تباہی سے بچالینے کی کل ذمے داری وہ صرف اپنی صبر آما محنت و مشقت اور لگن کے دعووں پر نہیں رکھے گا جس کے نتیجے میں وہ خود عوام سے معاشی اور روحانی امتیاز کی دنیا میں مگن رہ سکے ۔۔۔ نہ وہ اپنے ہاتھی کے لیے وشنو بننا چاہے گا نہ عدل کی گھنٹی کے ساتھ جہانگیر، نہ آتند پال، نہ نہرو، بلکہ وہ انہی عوام میں سے ایک انسان ہوگا، لگ بھگ انہی کی طرح زندگی گزارنے والا جو خود عوام سے حاصل کیے ہوئے نئے نئے تصورات اور خیالات سے انھیں بھی متحرک رکھے گا اور خود بھی اعلیٰ تصورات اور عظیم کام انجام دے گا۔ وہ رہنما عوام کا نمائندہ نہیں ہوگا بلکہ خود عوام میں بھی اس کی رہنمائی کی جھلک ملے گی۔"

رام منوہر لوہیا